شعور

بہت گھٹن ہے کوئی صورتِ بیاں نکلے
اگر صدا نہ اٹھے، کم سے کم فغاں نکلے

فقیرِ شہر کے تن پر لباس باقی ہے
امیرِ شہر کے ارماں ابھی کہاں نکلے

حقیقتیں ہیں سلامت، تو خواب بہتیرے
ملول کیوں ہوں؟ جو کچھ خواب رائیگاں نکلے

ستم کے دور میں ہم اہلِ دل ہی کام آئے
زباں پہ ناز تھا جن کو وہ بے زباں نکلے

ساحر لدھیانوی

اگست ۱۹۶۵ء • مدیر: سبطِ اختر • قیمت ۲۵ پیسے

پاکستان کی ترقی و خوشحالی کیلئے
تمام غیر ملکی صنعتوں، انشورنس
کمپنیوں اور بینکوں کو قومی ملکیت
قرار دیا جائے ——!

عطیہ ——— اشتہار

عزیز جمال

29C. 28th STREET BLOCK —6 P.E.C.H.S KARACHI 29

حیات و کائنات کا ترجمان

جلد نمبر ۲ | مدیر سبط اختر | شمارہ نمبر ۸

منشور

قیمت فی پرچہ پچیس ۲۵ پیسے

سال بھر کیلئے تین روپے

چھ ماہ کیلئے ایک روپیہ پچاس پیسے

ناشر:۔ سبط اختر

مشہور پریس میکلوڈ روڈ کراچی

پتہ

منشور:۔ ایرو سیز ایمپلائز یونین پی آئی اے برانچ کراچی

ایئرپورٹ ۔ فون نمبر ۴۹۱۶۹

اس منشور میں

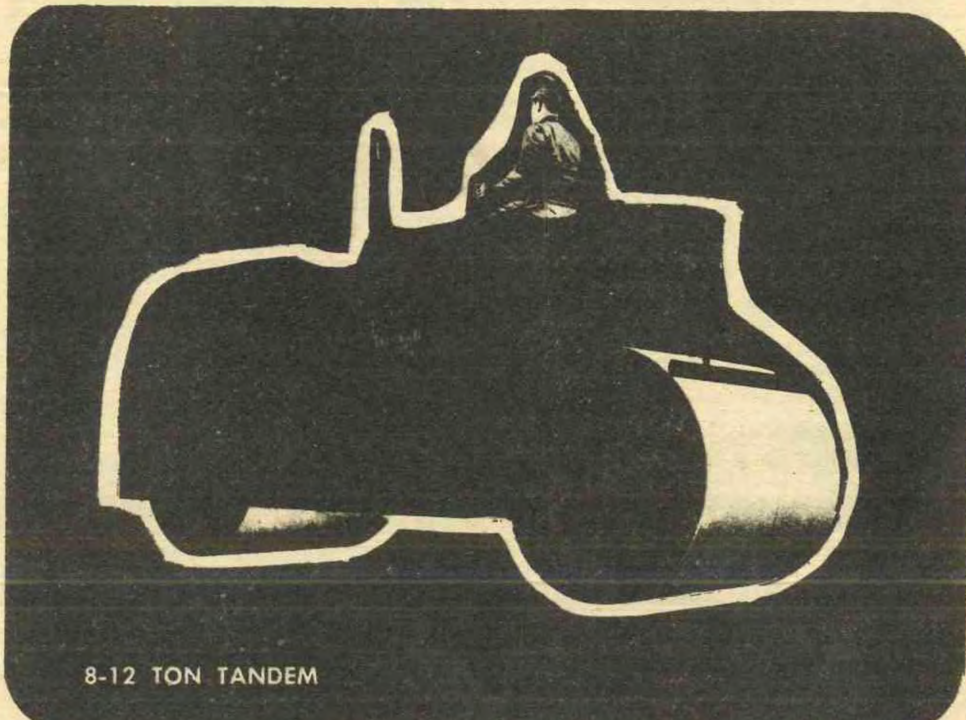
CONTACT : A. G. AHMAD & SONS, 49 NOOR CHAMBERS,

BUNDER ROAD, KARACHI,

SOLE AGENTS FOR

Ferguson

TANDEM ROLLERS



8-12 TON TANDEM

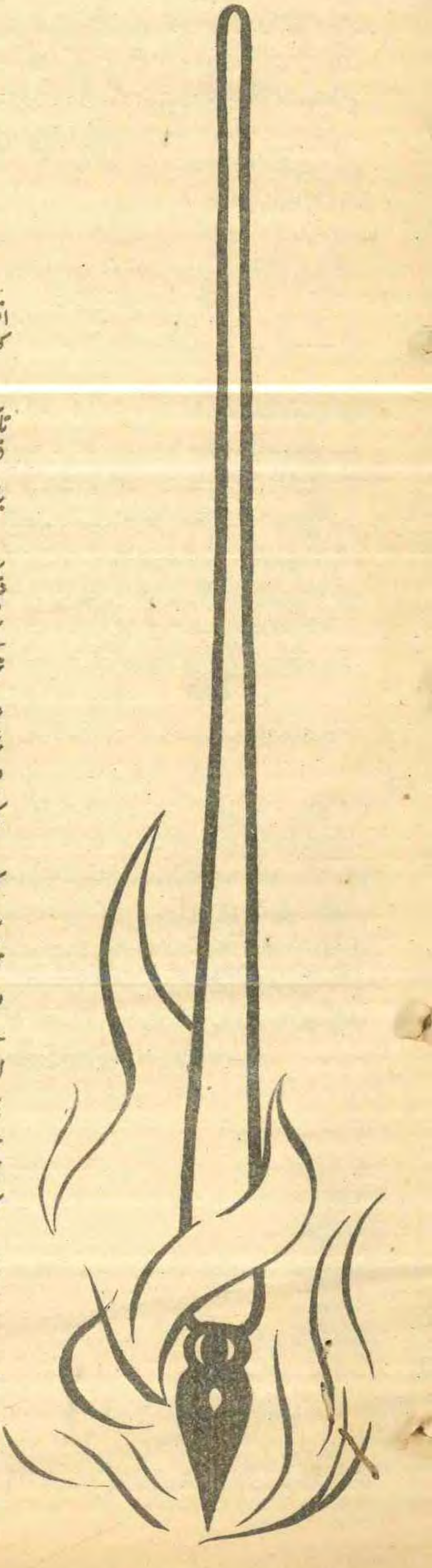
Smaller models available in sizes 2-3, 3-5, and 4-6 ton.

manufactured by

SHOVEL SUPPLY COMPANY, INC.

OFFICE AND PLANTS: 4900 HARRY HINES BLVD. • MAILING ADDRESS: P. O. BOX 1369 • DALLAS 21, TEXAS
CABLE ADDRESS: SHOCO, DALLAS • TELEPHONE: MElrose 1-3000

ہوئے تم دوست جسکے ......



امریکہ نے اپنے ترکش سے پھر ایک زہریلا تیر پھینکا ہے۔
اس کی درخواست پر پاکستان کے تیسرے پنجسالہ منصوبے کے لئے دی جانے والی اقتصادی امداد روک دی گئی ہے اور فی الحال امداد دینے والے ممالک پر مشتمل ادارہ —— کنسورشیم کا اجلاس ستمبر تک ملتوی کر دیا گیا ہے۔

ہمیں اپنے منصوبے کے آغاز میں اس امداد سے متعلق تمام تفصیلات کی ضرورت تھی۔ تاکہ اندازہ لگا کر اس منصوبے پر بہ اطمینان قلب عملدرآمد شروع کریں۔ مگر بین الاقوامی قواعد و ضوابط بنانے اور پھر خود ہی انھیں توڑنے والے یہ نام نہاد ٹھیکیدار اپنے الٹ پھیر سے باز نہیں آئے۔

امریکی سامراج کی غیر اصولی تاریخ، سیاسی سودے بازی کی ان ناکام مثالوں سے بھری پڑی ہے، ہمارے سامنے کمبوڈیا، مصر، انڈونیشیا، کیوبا۔ اور انتخابات سے پہلے کے سیلون کی مثالیں موجود ہیں کہ ابھی امریکہ اپنی سامراجی کمان سے یہ تیر پھینکنے بھی نہ پایا تھا کہ ان ممالک کے محب وطن سربراہوں نے پہلے سے نشانہ جما کر وہ انقلابی تیر پھینک ڈالے جن کی زد میں آکر خود سامراجی کمان ہی ٹوٹ گئی۔ صدر ناصر نے کہا کہ:۔ "اے سامراجیو تم دریائے نیل میں غرق ہو جاؤ" اور صدر سوئیکارنو نے حکم دیا کہ:۔ "جہنم میں جل مرو ——" مسرت و شادمانی کے وہ یادگار نعرے تو کوئی بھول ہی نہیں سکتا جو ان ممالک کے عظیم، امریکہ کی سات پشتوں سے واقف و باخبر عوام نے اپنے اپنے رہنماؤں کی اختیار کردہ اس سامراج دشمن پالیسی کی تائید میں لگائے تھے۔

یہ ہماری حماقت ہے کہ ہم غنیم کے ارادے کو، وقت سے قبل ہی نہ تاڑ سکے۔ اور امریکہ کو پہل کرنے کا موقع دے بیٹھے، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ پی آئی اے کی ٹوکیو سروس کے سلسلے میں جاپانی حکومت پر امریکی دباؤ، ڈھاکہ کے ایئرپورٹ کی تعمیر کے سلسلے میں امریکی امداد کی واپسی، صدر مملکت کے دورہ امریکہ کی یکطرفہ تنسیخ اور پھر بھارت کو دھڑا دھڑ اسلحہ جات کی فراہمی یقیناً ایسے واقعات تھے! اور ہیں جن کے آئینے میں امریکی سامراج کی ساری پاکستان دشمن خباثت بہ آسانی نظر آجاتی ہے۔ مگر یہ ہماری بدنصیبی کی انتہا ہے کہ جب تو جب اب بھی ہمارے ایوان نمائندگان میں ان "باغوت" افراد کی نشستیں محفوظ ہیں جو کھلم کھلا، اس زمانے بھر کے دشمن نمبر ایک، امریکہ کو اپنا دوست کہہ رہے ہیں۔ کہا نہیں جا سکتا کہ اس ترقی یافتہ دور، بیسویں صدی میں دوستی کے اصول بدل گئے ہیں۔ یا —— حب الوطنی کی قدروں میں تبدیلی کر دی گئی ہے بہر طور گھر کے ان "محب وطن رہنماؤں" سے قطع نظر یہ بات پھر بھی اطمینان بخش ہے کہ خود کنسورشیم کے ممبر ممالک نے، امریکہ کے اس مجرمانہ فیصلے کی مذمت کی ہے۔ اور تو اور خود صدر مملکت کی سمجھ میں بھی یہ بات آگئی ہے کہ "سزا" پاکستان کو اس "جرم" کی پاداش میں ملی ہے کہ پاکستان نے اپنے اشتراکی پڑوسیوں، چین اور روس سے گہرے تعلقات قائم کئے ہیں، کہ پاکستان، افریشیائی، اتحاد کے لئے سرگرداں ہے، کہ پاکستان، ویٹ نام میں امریکی جنگی حکمت عملیوں کے خلاف ہے، کہ پاکستان، سامراج اور اس کے پروردہ افراد کی مذمت کر رہا ہے۔ کہ پاکستان ہندوستان کو دی جانے والی زبردست فوجی امداد کا کٹر مخالف ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ امدادی ادارے کی میٹنگ کے التوا کے بعد کی جانے والی انکی تقریر کے مطالعہ سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اب ان کی سمجھ میں یہ بات بھی آگئی ہے کہ امریکہ صرف انھیں ممالک کو امداد دیتا ہے جو اس کے ادنیٰ اشاروں پر رقص کرتے رہیں۔ جو افریشیائی برادری کے رکن ہونے کے باوجود اس سے غداری کرکے، سامراج کی جوتیاں صاف کرتے رہیں، اور جو اپنے ملک کی دولت ان کے قدموں میں ڈالتے رہیں۔ حالانکہ صدر جانسن نے اجلاس کو ملتوی کرنے کی درخواست کے لئے امریکی کانگریس کی منظوری کا بہانہ پیش کیا ہے۔ مگر یہ کون

نہیں جانتا کہ اس سے پہلے امریکی کانگرس کی منظوری لئے بغیر ہی یہ ادارہ بھارت کو بھاری امداد کا یقین دلا چکا ہے ۔۔ یہ سارے واقعات یہ تمام حقائق اس جھوٹ کا پول کھول رہے ہیں کہ امریکی امداد قطعی "غیر مشروط" ہوا کرتی ہے امریکی امداد ۔ یا قرضہ کا کچا چٹھا کسے نہیں معلوم ۔۔؟ یہ وہ مہاجنی جال ہوتے ہیں ۔ جنکے ذریعہ سیاسی آزادی کا ہی سودا نہیں کیا جاتا، بلکہ قرضہ وصول کرنے والے ملک کو معاشی طور پر پسماندہ ہی رکھنے کے جتن کئے جاتے ہیں کیونکہ ان قرضوں کی شرح سود، دوسرے قرضوں کی شرح سے زیادہ ہوتی ہے ۔ یہ ہی نہیں بلکہ امریکہ کے دیئے ہوئے ان قرضوں سے ہم صرف امریکی مال ہی خریدنے پر مجبور رہیں ۔ اور یہ مال بھی دوسروں کے تیار کردہ مال سے زیادہ مہنگا ہوتا ہے ۔ اور سونے پر، سہاگا یہ کہ مال بھی امریکی جہازوں میں لانا پڑتا ہے ۔ جن کا کرایہ دوسروں کے جہازوں سے بہت زیادہ ہوتا ہے اور یہاں ان قرضوں کی ایک خصوصیت یہ بھی تو ہے کہ امریکہ سے حاصل کردہ ساری امداد یا قرضہ کی منصوبہ بندی، امریکہ کی فاضل آبادی کے نمائندے یعنی "ماہرین" کریں گے ۔ یہ ہے وہ کھیت جسکی بدولت، امریکہ کے بے روزگاروں کو ہماری گردن پر "سفید ہاتھیوں" کے روپ میں سوار کرایا جاتا ہے، ان مفت خوروں کو پاکستانی معیار کے مطابق نہیں ۔ بلکہ امریکی معیار کے مطابق تنخواہیں دینی پڑتی ہیں ۔۔۔ اب امداد قرضہ اور اس کے استعمال کی یہ حقیقت ظاہر ہے کہ، کتنی "دوررس" ہوگی ۔۔۔؟ اور پھر ان تمام باتوں کے نتیجے میں ترقی کے عملی مظاہر سامنے آئیں یا نہ آئیں آپ کے لئے ساری رقم بمعہ سود واپس کرنا بھی "آداب دوستی میں" داخل ہے ۔

قوم نے جس طرح صدر مملکت کے حالیہ سامراج دشمن اقدام کی حمایت کی ہے، لازمی ہے کہ صدر مملکت بھی اسی طرح قوم کی سامراج دشمن دیرینہ خواہشات کو پورا کرنے کے لئے مزید موثر ٹھوس اور فوری قدم اٹھائیں گے ۔۔ دولت مشترکہ، سیٹو، سینٹو، اور پاک امریکی فوجی معاہدہ کی رکنیت ختم کر کے مغربی لیڈروں سے اپنا پیچھا چھڑائیں مساوات اور برابری کے اصولوں پر سب سے تعلقات قائم کریں ۔ ذلت و رسوائی کے طمانچے کھا کھا کر، سامراج کا اس امر پر شکریہ ادا کرنا، کہ اس نے ہمارے اندر انتقامی جذبہ پیدا کر دیا، کوئی مستحسن رویہ نہیں ہے ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم خود اعتمادی کے ساتھ اپنے آپ ہی پہل کرنے کے اعلیٰ رتبہ اور روشن موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں ۔ غلط ہر حال میں غلط ہے اور غلطی کا ساتھ دینا، اسے گوارہ کرنا بھی کوئی کم غلطی نہیں، لوہا گرم ہے، ہمیں وار کرنا ہی ہوگا ۔ ہمارے اپنے ذرائع و وسائل کچھ کم نہیں، ہماری اپنی ہمت و صلاحیت کچھ کم نہیں ۔ ہماری اپنی دانش و بصیرت کچھ کم نہیں، پھر آخر ہم کیوں نہ گھر کے بال بچوں کا دودھ پی جانے والی بدنیت بلی کی گردن پہلے ہی مروڑ ڈالیں ۔

یہ گھڑی یہ لمحہ ان گھڑیوں اور لمحات میں سے ہے جو صدیوں کی تاریخ پر بھاری ہوتے ہیں ۔ ہمیں چاہیئے کہ قدم بڑھا کر اور جام اٹھا کر عنانِ زیست تھام لیں ۔

اس نئے سفر پر جانے کے لئے اگر واقعی ارادہ باندھ لیا گیا ہے تو یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ پرانے چراغوں سے کام نہ چلے گا، وزرار، کبرار، امرار اور دوسرے عمائدین مملکت کتنے ہی ذہین، بردبار کیوں نہ ہوں بہر حال افراد ہی تو ہیں کہ نہ جانے کب راہ میں دم لینے کے لئے بیٹھ جائیں ۔ نئے سفر میں نئے ہمسفر ساتھ لینے چاہئیں، مزدور اور کسان کی شرکت اس سفر کی کامیابی کی ضمانت ہے، دانشور اور صنعتکار کی معاونت اس سفر کی سہولت کے لئے شرط ہے جمہوری حقوق کی بحالی اور عام رواداری کی اس سفر میں زادِ راہ کی سی حیثیت ہے ۔ ان سارے لوازمات کا انتظام اور اہتمام کر لینا اشد ضروری ہے، کیونکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ گھوڑے کے پاؤں میں نعل لگانے کے لئے میخ نہ ہونے کی وجہ سے ساری فوج ہار جاتی ہے ۔ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت میں لے کر اس سفر کے لئے سارا مطلوبہ ساز و سامان فراہم کیا جا سکتا ہے، اور کیا جانا چاہیئے ۔ تاکہ ہمارا شک و شبہ بھی نہ رہے اور فتحمندی یقینی ہو جائے ۔!



اے وطن

محبِ وطن

نیا تعلیمی سال آتے آتے پھر اپنے دامن میں طالبعلموں کے داخلے کا پرانا مسئلہ سمیٹ لایا۔

ہمیشہ کی طرح اب بھی سرپرستوں کا یہ شکوہ بجا ہے کہ جب تک ــــ سفارشں علی خاں سے انکی قرابت داری نہ ہو یا کسی طرح رشوت علی خاں سے کوئی ناطہ نہ جوڑا جائے تب تک وہ اپنے بچوں کو بارگاہ علم میں داخل نہیں کرا سکتے اور اگر یہ کر بھی لیا جائے تب بھی یہ کڑوی کسیلی حقیقت آپ کا منہ چڑاتی رہے گی کہ جتنے طلبا کو داخلہ مل پاتا ہے، ان کی تعداد، داخلہ نہ حاصل کر سکنے والے طلباء سے بہر طور کم ہی ہوتی ہے۔

ہم اپنی "آزادی" کی اٹھارھویں سالگرہ منانے جا رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ جانکاہ مسئلہ جاری اور برقرار رہے۔ خود ہمارے تعلیمی نظام کا ڈھانچہ بھی جوں کا توں ہے۔ اسکولوں میں داخلہ نہ ملنے کی شکایت اس وقت ہے جبکہ ان میں پڑھائی جانے والی باتیں، وقت کی ضروریات کے مطابق ٹھوس اور تعمیری نہیں۔ جس زبان میں یہ باتیں پڑھائی جاتی ہیں، وہ اپنے ملک کی زبان نہیں۔ جو ذہنیت ان میں پڑھ کر پروان چڑھتی ہے وہ ہمارے کسی کام کی نہیں۔ جو فیس ان میں وصول کی جاتی ہے وہ عام باشندوں کی معاشی زبوں حالی کے مطابق نہیں، جو کتابیں وہاں پڑھائی جاتی ہیں۔ وہ کئی کئی مہینوں تک بازار میں نہیں ملتی، اور اگر مل بھی جائیں تو اتنے مہنگے داموں پر بکتی ہیں کہ عام طالب علموں کے پاس انھیں خریدنے کے لئے "مایا" نہیں، اس ناگفتہ بہ صورت حال، کو ختم کرنے یا کسی حد تک گوارا بنانے کے لئے "نصابی کتب" کی لائبریریوں کا کوئی انتظام اور سلسلہ نہیں، ان اسکولوں کی عمارتیں طالب علموں کی اقامت گاہوں سے میلوں دور ہیں۔ آمدورفت کے لئے کوئی خاص انتظام نہیں، ان کے لئے کرایا آمد و رفت میں کوئی مالی رعایت نہیں، ان اسکولوں میں پڑھانے کے لئے تربیت یافتہ اساتذہ نہیں اور اگر ہیں تو وہ معاشی اور سماجی مشکلات کی وجہ سے ذہنی طور پر مطمئن نہیں۔ تجربہ گاہوں میں سائنسی ساز و سامان نہیں۔ کوئی ثقافتی، تہذیبی ــــ تفریحی پروگرام نہیں ــــ سال بھر تک ان اسکولوں میں پڑھنے کے بعد۔ سالانہ امتحانات کے جو نتائج ہوتے ہیں ان میں کامیاب طلبا کی شرح ۵۰، ۶۰ فی صد سے زیادہ نہیں ـــ ان تمام "دل خوش کن خوبیوں" کے باوجود طلبا ان "معیاری" اسکولوں میں داخلہ لینا چاہتے ہیں تو ان کے لئے ان اسکولوں میں "جگہ" نہیں۔

اور پھر مسئلہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا، جو طلبا ر کامیابی حاصل کر لیتے ہیں مگر ان کی ڈویژن تھرڈ یا سیکنڈ ہی ہوتی ہے۔ وہ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے محروم رکھے جاتے ہیں۔ بالکل ایسے جیسے کہ وہ چھٹی انگلی ہوں۔ کون نہیں جانتا کہ دوسرے اور تیسرے درجے میں پاس ہونے والے طالب علموں کی اکثریت اپنی پڑھائی کے ساتھ ساتھ اپنے گھر والوں اور خود اپنی زندگی کا بوجھ اٹھانے کی بھی ذمہ داری اٹھانے پر مجبور ہے۔ مگر اس ذمہ داری کا احساس کا معاوضہ انہیں "داخلہ نہیں ہو سکتا" کے "پر لطف" جملوں کی شکل میں دیا جاتا ہے کوئی بتائے کہ یہ بیچارے اس لطف و عنایت کو لے کر کہاں جائیں اور پھر یہ سب کچھ اس وجہ سے نہیں کہ ملک میں دولت اور سرمائے کی کمی ہے۔ جو بھی یہ کہتا ہے وہ جھوٹ بولتا ہے، خود دھوکہ کھاتا ہے یا دوسروں کو دھوکہ دینا چاہتا ہے کیونکہ ہم روزانہ اخبارات میں، زمینداروں، جاگیرداروں، مالداروں، سرکاری افسروں اور وظیفہ خوروں کے ہوتے سوتے کی تصویریں دیکھتے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے بیرونی ممالک تشریف لے جا رہے ہیں۔ اور یہ تو معمولی سے معمولی آدمی کی سمجھ میں آ جانے والا کھلا راز ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت پر بے شمار ڈالر اور پونڈ تر بالفاظِ دیگر غیر ملکی زرِ مبادلہ صرف کیا جاتا ہے۔ اور زرِ مبادلہ جو ہماری بین الاقوامی اور وقار کی بنیاد ہے۔ ہمارا موقف خدانخواستہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ فنی اور اعلیٰ تربیت کے یہ سارے پروگرام منسوخ کر دیئے جائیں ہمارا تو کہنا یہ ہے کہ بنجر زمینوں کو زرخیز بنا کر، زمین کسانوں کو دے کر، صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے کر، بینکوں، انشورنس کمپنیوں، حمل و نقل کے ذریعوں زمین پانی اور ہوا میں موجودہ پیداوار کے تمام وسیلوں کو عوام کے مفاد میں سرکاری انتظام میں لا کر، بیرونی صنعتکاروں اور سامراجی ممالک کی دولت کو ضبط کر کے ـــ قارون کا وہ خزانہ حاصل کیا جائے جو ہمارے بے برگ و گیاہ، وطن کو ہمدوشِ ثریا بنا دے۔

اور پھر ایک پہلو اور ہے اس تصویر کا ـــ وہ یہ کہ آج وطن عزیز میں کوئی چیز نہیں جو جنس بازار نہ بن چکی ہو ـــ یہ چیز خواہ کتنی ہی مقدس کیوں نہ ہو، کتنی ہی عزیز کیوں نہ ہو، کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو آپ کو منڈی میں ضرور، بالضرور مل جائے گی۔ بیوپاریوں اور تاجروں کی، "غیبی دسترس" سے کوئی بھی شے دور نہیں رہتی۔ مگر رونا تو اس بات کا ہے کہ یہاں تعلیم کا مسئلہ تجارتی پیمانے پر بھی حل کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ حالانکہ تجارت اور علم میں قطبین کا فرق اور بعد ہے۔ مگر حالات کی سنگینی کے پیش نظر تو ہمارے لئے یہ بھی غنیمت ہی ہے کہ اگر اور کچھ نہیں تو داخلوں کا یہ مسئلہ تجارتی پیمانے پر زیادہ سے زیادہ تعلیمی مراکز قائم کر کے ہی حل کرنے کی نیت باندھی جائے اور بعد میں صورت حال سے طالبعلم خود ہی نبٹ لیں گے کہ اعتدال و توازن جہاں نہ ہو، وہاں قائم کرنا اور ہونا قانونِ قدرت ہے۔

کیا کوئی یہ سوچ بھی سکتا ہے۔ کہ آزادی کے سترہ سال گزارنے کے بعد بھی،

اپنے ہموطنوں کی اکثریت غالب کی نکتہ آفرینی، میر کے درد، اقبال کے فلسفے، سرسید کی بلند ہمتی، حسرت کی شوریدہ سری اور محمد علی جناح کی قانونی موشگافیوں سے بے بہرہ رہے گی، سائنسی معجزوں سے بے خبر رہے گی، جغرافیائی دریافتوں سے نابلد رہے گی، تاریخی صداقتوں سے بے خبر رہے گی، مذہبی تعلیمات کی جگہ فرقہ وارانہ تعصبات کو جگہ دیتی رہے گی ــــ ممکن ہے کہ کوئی بھانپنے والا یہ بھانپ چکا ہو۔ مگر یہ تو خیر کسی کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ الف ب ت کی تختی اور ایک دو تین کی گنتی، لکھنا پڑھنا بھی ہموطنوں کے لئے "اعلیٰ تعلیم" کی حیثیت اختیار کر لیگی۔

ہمارے لب ولہجے میں یہ لاچارگی اور یہ بے بسی دراصل اس لئے جگہ پا رہی ہے کہ ہماری آنکھیں، دن رات، ہر لمحے اور ہر گھڑی، اس نسل کو تباہ وبرباد ہوتے ہوئے دیکھ رہی ہیں جس کے کاندھوں پر مستقبل میں اس وطن کا بوجھ ڈالا جائے گا۔ ہم آج اندازہ لگا رہے ہیں کہ جہالت، بے مقصدیت اور بے زاریت کے موذی جراثیم نے ان "مضبوط" کاندھوں کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا کرنا شروع کر دیا ہے، مقام فکر ہے کہ اگر یہ کاندھے ان مہلک کیڑوں کی یلغار کی نذر ہو گئے تو کیا ہوگا؟ بزرگوں کی امانت پاکستان کی رکھوالی کون کریگا؟ مغربی سامراج کے نت نئے ہتھکنڈوں کا دندان شکن جواب کون دیگا۔ ملکی منافع خوری کی وحشیانہ دبترد سے معصوم ہموطنوں کو کون بچائے گا۔ ہم سب کے روشن مستقبل اور پرامن ماحول کی ضمانت کون دیگا کون ان سوالات کے جواب دینے کی "زحمت" گوارہ کرے؟ کہ آج یہ سوالات ایوان ہائے بلند وبالا کی مضبوط فصیلوں سے ٹکرا ٹکرا کر بے نیل ومرام واپس آجاتے ہیں آج یہ سوالات اپنی اپنی مصیبتوں میں گرفتار اور پریشان حال انسانوں کی برفانی بے رخی اور عدم دلچسپی کی بھاری سلوں میں منجمد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ذہن کی ساری جولانیاں رکنے سی لگتی ہیں۔ جب یہ سوالات اس "فکوکدے" میں ابھرتے ہیں ــــ جسمانی ترنگیں اور مستیاں آہستہ آہستہ اپنے آزمودہ ہتھیار ڈھالنے لگتی ہیں۔ جب قنوطیت اور لاتعلقی کے مہیب سائے امنڈ امنڈ کر آتے ہیں۔ کیا کریں؟ کیا نہ کریں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ ہماری حماقت ہے کہ ہم نے اپنے ماضی کو نہیں سنوارا۔ یہ ہماری غیر ذمہ داری ہے کہ ہم نے اپنے حال کو نہیں نکھارا۔ اور اب تو داخلوں کے لئے دربدر مارے مارے پھرنے والے ان طالبات علم کو دیکھ دیکھ کر، کچھ ایسا لگتا ہے کہ مستقبل کا تجربہ بھی رائیگاں جارہا ہے اور مستقبل بھی ماضی اور حال کی طرح ضائع ہو جائے گا۔ ماضی وحال کا غم وشکوہ نہیں مگر یہاں مستقبل کا لرزہ ضرور طاری ہے۔

لیکن مایوسی کفر ہے۔ پست ہمتی۔ اشرف المخلوقات انسان کی توہین ہے۔ مردہ دلی ہم سب کی تذلیل ہے۔ ابھی وقت کی باگیں ہمارے ہاتھ میں ہیں ہمارا اب کچھ نہیں بگڑا۔ اگر ہم چاہیں تو اب بھی حیران کن روایات قائم کر سکتے ہیں۔ مگر ضرورت "چاہت" کی "تقاضہ" خواہش کا ہے۔ اس دنیا میں ایسی قوموں کی کمی نہیں جنہوں نے ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے۔ اور میدانوں کے ساتھ ساتھ علم وتدریس کے میدان میں بھی رات کو دن کر دکھایا ہے۔ معاملہ حوصلے اور ارادوں کا ہے۔ اگر یہ دونوں ہیں تو منزل کا راستہ خود بخود مل جائیگا اور کامیابی کی منزل پیروں تلے آجائے گی۔ باشعور اور محب وطن سماجی اور سیاسی کارکنوں سے ہماری فریاد ہے کہ وہ سارے ملک میں تعلیم وتدریس کا رضاکارانہ سلسلہ شروع کرکے اپنا فرض انجام دیں۔ داخلے سے محروم رہ جانے والے شمع علم کے پروانوں کو خود پڑھائیں، خود سکھائیں۔ جگہ بجگہ شبینہ مدارس قائم کریں تعلیم بالغان کے مراکز کھولیں۔ اپنے آپ کو ہر قسم کی تکلیف دے کر اس مسئلہ کو اپنے طور پر کسی نہ کسی حد تک حل کرنے کی حتی الامکان کوشش کریں۔

عوام سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اپنے نودمیدہ غنچوں کو گلستان علم کی معطر ہواؤں سے بہر قیمت نوازیں، خود ننگے رہیں، بھوکے رہیں اور اپنے جگر پاروں کو فطرت کے رازہائے سربستہ سے آگاہ اور باخبر رکھنے کے لئے جو کچھ کر سکتے ہیں کر گزریں۔

دل میں درد رکھنے والے اہل ثروت سے ہماری اپیل ہے کہ زیادہ منافع کی لالچ سے بچیں، نئی نئی اور زیادہ سے زیادہ درسگاہوں کے قیام کا سہرا اپنے سر باندھ کر قوم کی دعائیں لیں۔ خود انکی اپنی بڑھتی ہوئی صنعت اور تجارت کو تعلیمیافتہ افراد کی ضرورت ہے۔

حکومت سے ہمارا مطالبہ ہے کہ وہ تعلیمی مسئلہ کو سرفہرست رکھ کر عملی اقدامات اٹھائے، قوم کی بے پناہ صلاحیتوں کو ملک ووطن کی عظمت وبرتری کے لئے استعمال کرے۔ مستقبل کے امینوں کو راہ راست پر لگانے کے لئے۔ خود بھی راہ راست پر آئے، تعلیم عام کرے، ہوش کے ناخن لے اور مسئلہ کی اہمیت اور شدت کو سمجھتے ہوئے دولمندوں پر "تعلیمی ٹیکس" لگا کر فوری طور پر اس مسئلہ کو حل کرے، درسگاہوں کے دروازوں پر داخلے کے لئے گھنٹوں کھڑے رہنے والے طلبا اسکی توجہ کے طلبگار ہیں۔ ضرورت ہے کہ انکی طلب پوری کر دی جائے۔ ورنہ ان کی ضیابار آنکھوں سے برق وشرر برسیں گے۔ ان کے ہاتھ کتابیں اٹھانے کی بجائے سنگ باری کریں گے یہ دستار فضیلت باندھنے کی بجائے درسگاہ نہ بنانے والوں کے گھروں پر دھرنا دے کر بیٹھ جائیں گے۔

صحرا بہ صحرا کو بہ کو

مارکو پولو

دو انقلابی ۲

کل کے دوست آج کے دشمن!

الجزائر —— دوسری افروایشیائی کانفرنس —— بن بیلا —— بومدین —— اور مغربی پریس —— یہ سب کے سب پچھلے دنوں کچھ اتنے گڈمڈ ہوگئے تھے کہ انھیں ایک دوسرے سے جدا کرنا ایک عام اخبار کے لئے بھی ناممکن ہوگیا تھا۔

۲۰ رجون ۶۵ کو کرنل بومدین نے صدر بن بیلا کا بڑے چپ چپاتے تختہ الٹ دیا تو مغربی پریس نے واویلا مچایا کہ خدا کی پناہ۔

ایک وقت تھا کہ بن بیلا کو افریقی کا "سرڈو" آمر" کا خطاب دینے والا یہی مغربی پریس تھا۔ اسی پریس کے ذریعے دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی رہی تھی کہ بن بیلا نے بن خدہ کو ہٹا کر پورے الجزائر کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا ہے درحقیقت الجزائری عوام اس شخص کو پسند نہیں کرتے۔ یہی پریس ہے کہ اب ساری دنیا کو یہ جتانے کی کوشش کر رہا ہے کہ بومدین دراصل ایک نک چڑھا سنکی، تارک الدنیا، غیر مقبول، فوجی ذہنیت رکھنے والا کٹر مسلمان، انتہا پسند کمیونسٹ گروہ بندی کا عادی، غاصب اور جانے کیا کیا ہے اور اس کے مقابلے میں بن بیلا ہی عوام کا مقبول ترین ہیرو ہے۔ جسکے حق میں سارے الجزائری عوام مظاہرے کر رہے ہیں۔ الجزائر کے گلی کوچوں میں بن بیلا "زندہ باد" کا نعرہ نوشتۂ دیوار کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔ سیکڑوں افراد جیل میں بند کر دیئے گئے ہیں اور لاتعداد محب وطن گولیوں کا نشانہ بن چکے ہیں، غرض کہ وہ سارے "خطابات" جو آج سے پہلے بن بیلا کو دیئے گئے تھے۔ اب بومدین کو دیئے جا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ یہ دراصل مغرب کے آزاد پریس کا دیرینہ شیوہ ہے۔ یہ نام نہاد آزاد صحافی ذاتی مفادات کا چشمہ لگا کر سامراج دشمن تحریکات، شخصیات اور واقعات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور اپنے اس مشاہدے میں جو کچھ دیکھتے ہیں وہ ظاہر ہے کہ اصل حقائق سے کتنا بعید تر ہوتا ہے کہ خود انکے اپنے سابقہ بیانات کی متواتر تکرار اور تکذیب ہوتی رہتی ہے۔

الجزائر کے نئے انقلابی رہنماؤں کو "انقلاب دشمن" ظاہر کرنے کی سرتوڑ کوشش کی جا رہی ہے۔ انقلابی حکومت کے اس اعلان کے باوجود کہ وہ پہلے کی طرح سامراج دشمن رہے گی، حریت پرست قوتوں کی اتحادی رہے گی، قومی آزادی کی جدوجہد کی معاون و مددگار رہے گی —— یہ کہہ کہہ کر افروایشیائی برادری میں ہر ممکن غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں کہ نئی حکومت الجزائری انقلابی تحریک سے روگردانی کرے گی —— یہ ہیں وہ حالات جن میں واقعات کا تجزیہ کرنا حد سے زیادہ مشکل بنا دیا گیا ہے۔ الجزائر کے فوجی انقلاب کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ الجزائر کی فوج کے تاریخی اور انقلابی کردار کا جائزہ لیا جائے۔ الجزائری فوج دنیا کی دوسری باقاعدہ تنخواہ دار فوجوں سے قطعی مختلف ہے۔ اس فوج نے اپنے وطن کی آزادی کے لئے فرانسیسی استعماریوں کو فیصلہ کن شکست دی۔ یہ فوج وہ ہے جس کے جوانوں نے اپنے خون سے آزادی کے پرچم کو سرخ کیا اور تاریخ میں ایک طویل گوریلا جنگ جیت کر ایک ایسے باب کا شاندار اور حیران کن اضافہ کیا جو نہ صرف افریقہ میں بلکہ ساری دنیا میں اپنا ایک بلند اور منفرد مقام رکھتی ہے۔ اس فوج کا بنیادی کردار صرف عسکری ہی نہیں بلکہ سیاسی بھی ہے۔ یہ صرف ڈسپلن ہی کی پابند نہیں بلکہ بیدار شعور کی بھی مالک ہے۔ یہ تو ہوا اس فوج کا کردار۔ خود اس کے قائدین کا یہ عالم ہے کہ بومدین، سلسلۂ حیات برقرار رکھنے والے اپنے تندرست اور توانا پھیپھڑوں کو تپ دق کے موذی کیڑوں کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اس کے باوجود بھی آج قومی جدوجہد میں کسی سے پیچھے نہیں۔ الجزائر کے اس مایہ ناز سپوت نے انقلابی فوج کی ترتیب اور تشکیل کے زمانے میں ہی اپنی بے پناہ صلاحیتوں کو منوا لیا تھا۔ جنگ آزادی کے متوالوں کو اسی نے تربیت دی تھی اور خود اسی شخصیت نے آزادی کے بعد الجزائری انقلاب کو اعتدال پسند اور سمجھوتے باز دشمنوں سے بچایا۔ بلکہ تاریخ میں انکا یہ کردار بھی زریں الفاظ میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ انھوں نے ہی بن بیلا کو موقع پرست سازشوں کے ناپاک حملوں سے محفوظ رکھا —— یہ ہے وہ فوج، اور یہ ہے وہ فوجی رہنما جس پر آج نہ جانے کیسی کیسی بہتان تراشیاں کی جا رہی ہیں۔ ان ساری باتوں کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ بن بیلا ہے۔ نہ صرف ہماری بلکہ سب کی نظروں میں بن بیلا بھی قومی آزادی کا ناقابل فراموش کردار تھا، ہے اور رہے گا۔ اس فرزند جلیل نے، اپنی نوجوانی، آرام اور سکھ، اپنا مستقبل اور سب کچھ الجزائر انقلاب اور حرکت کی نظر کیا ہے۔ تاریک ترین اندھیروں میں سانس لئے ہیں۔ فرانس کا دشمن نمبر ایک قرار پایا ہے۔ اور انقلابی کامیابی کے بعد مصلحت پسند سیاستدان سے الجزائری عوام کو نجات دلائی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بومدین ان کا دست راست تھا۔ مگر یہ بھی صحیح ہے کہ بن بیلا بھی ایک زندہ اور روشن علامت تھا۔ آج بومدین نے شخصیت پرستی اور آمرانہ ذہنیت کے الزامات لگا کر بن بیلا کو نذر زنداں کر دیا ہے۔ ممکن ہے یہ الزامات محض الزامات ہوں۔ یا کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ناقابل تردید حقائق ہوں ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اس موضوع سے متعلق تفصیلات ابھی پردہ راز میں ہیں اور ہم ان سے بے خبر ہیں مگر یہ ہمارا وسواش اور ایمان ہے کہ جہد آزادی میں قربانیاں دینے کے لئے بن بیلا نے کبھی کسی قسم کی کوئی کنجوسی نہیں کی —— اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ تین سال تک من مانی اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا ہے تب بھی اس حقیقت کو تسلیم —— کرنا پڑیگا کہ نہ صرف حامیوں کو پیدا کرکے۔ بلکہ انھیں ڈھیل دینے میں موجودہ انقلابیوں اور براہ راست بومدین کا بھی پورا پورا ہاتھ ہے۔ کیونکہ انھیں کے بل بوتے پر یہ اختیارات حاصل کئے تھے اور اس کی موجودگی میں اس نے ان اختیارات کا استعمال ہے لہٰذا وہ بھی اس جرم میں برابر کے شریک ہیں جو اس وقت خاموش

اپنی چھیالیس سالہ زندگی میں صرف تین سال ______
تک ہی غلطیوں کا ارتکاب کیا بھی ہے تو بھی اسکی شاندار خدمات کے پیش نظر اسکی غلطیاں زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہیں۔ متنازعہ تین سال کے دوران اقتدار میں بھی، اس نے الجزائر کو افریقہ کی اہم ترین ریاست بنایا اور ساتھ ہی ساتھ بین الاقوامی سطح پر بھی الجزائری انقلابیوں کی ترجمانی اور نمائندگی کا اولین اور بھاری فرض بحسن و خوبی نبھایا ہے۔ اس لئے دوسرے افریقی ایشیائی ___ رہنماؤں کی توقعات کے مطابق یہ امید کرنا بے جا نہ ہوگا کہ بومدین اور دوسرے انقلابی رہنما، بن بیلا پر تنقید کرتے وقت خود پر تنقید کرنا نہ بھولیں گے۔ بن بیلا کا دامن چاک کرتے وقت خود اپنے گریبان میں بھی منہ ڈالیں گے۔ انصاف کی ترازو میں بن بیلا کی ۴۶ سالہ قابل فخر کارگزاریوں کے سامنے زیادہ رنج قرار دینے کی غیر منصفانہ تول نہ تولیں گے اور انقلاب آزادی، مساوات کی غیر معمولی الجزائری تاریخ کے اہم ترین کرداروں میں سے ایک کردار کے متعلق اپنا آخری فیصلہ کرتے وقت جذبات، تعصب، جلن، حسد اور مستقبل میں ایک زندہ دشمن کے مستقل خطرے سے خوف زدہ ہو کر کوئی ایسا فیصلہ نہ کریں گے جسکے نتیجے میں اڑنے والے خون کے چھینٹے خود ان کے انقلابی کردار کو داغدار کر دیں۔ اگر فرحت عباس بن خدہ ___ اور اسی قسم کے دوسرے الجزائری رہنما گولی کا نشانہ نہیں بنائے گئے تو یقینی طور پر بن بیلا اتنا خطاکار نہیں کہ اس کا سینہ خود اس کے اپنے ہی ہموطنوں کی گولی سے چھلنی کیا جائے۔

بن بیلا اور بومدین کی نظریاتی کشمکش سے قطع نظر جہاں تک الجزائر کے مستقبل کا سوال ہے اس کے متعلق ___ تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ کوئی وجہ نہیں کہ بومدین کی باتوں پر اعتبار اور یقین نہ کیا جائے ___ اس کا اندازہ ___ بومدین کے ان تاریخی الفاظ کی روشنی میں مستقبل کے جگمگاتے الجزائر کو بحسن و خوبی دیکھ کر لگایا جاسکتا ہے۔

"جدوجہد آزادی میں مصیبتیں محنت کش عوام
نے اٹھائی ہیں۔ آزادی کے ثمرات بھی
انہیں ملنے چاہئیں ___ زمین کاشتکاروں
میں تقسیم کی جائے اور کارخانوں کا حق
مزدوروں کو ملے ___ !!"

دولت مشترکہ کانفرنس

"دولت مشترکہ" کے سربراہوں کی کانفرنس، ہر سال کی طرح اس سال بھی پچھلے مہینے لندن میں منعقد ہوئی، اور ہمیشہ کی طرح اس کا افتتاح برطانوی وزیر اعظم نے کیا ___ ملکہ کے ساتھ گروپ فوٹو بھی ہوا ___ اور آخر میں ایک مشترکہ اعلامیہ بھی شائع ہوا ___ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ "یہ ہی" "روایت" ہے اور برطانیہ "روایات" کا بہت احترام کرتا ہے۔ خواہ وہ روایت ______ سامراجی عزائم میں سرخروئی حاصل کرنے کی ہو ___ خواہ نو آزاد ترقی پذیر ممالک کو، اپنے دام فریب میں الجھائے رکھنے کی ہو ___ بہر طور، برطانیہ، ان روایات کو قائم رکھنے میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ اور دولت مشترکہ میں شریک ممالک کسی نہ کسی انداز سے اس معاملے میں برطانیہ کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ حالانکہ تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ دولت مشترکہ، بھلے نام کی دولت مشترکہ ہو تو ہو مگر کام کی مشترکہ دولت نہیں ہے۔ بلکہ اصلیت پوچھو تو "برطانوی دولت" کے سوا کبھی کچھ نہ تھی نہ ہے اور نہ آئندہ ہوگی۔ یہ نام نہاد ادارہ دراصل ایک ایسا لبادہ ہے جس کو اوڑھنے کے بعد برطانیہ کا وہ پرانا بھرم قائم رہتا ہے کہ "برطانوی حکومت میں سورج کبھی نہیں ڈوبتا"۔ حالانکہ اب وقت بدل گیا ہے، حالات بدل گئے ہیں۔ مسائل بدل گئے ہیں اور ان کا حل جرأت و بیباکی، ذہانت و ایمانداری کا طلبگار ہے۔ مگر اس ادارے میں شامل جو ممالک ہیں وہ دور حاضر کے ان سارے تقاضوں کو آہستہ آہستہ پورا کرنے کی ٹھانے ہوئے ہیں وہ شاید یہ بھول گئے ہیں کہ برطانیہ ہی تو تھا جس نے سالہا سال تک ان پر تسلط قائم کر کے ان کا معاشی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی استحصال کیا ہے۔ ان ممالک کی موجودہ روش سے تو ایسا لگتا ہے کہ درحقیقت برطانوی سامراج ان ممالک کو "مہذب" بنانے آیا تھا اور جب یہ ممالک "مہذب" ہو گئے تو از خود اپنا بوریا بستر لپیٹ کر چلا گیا ___ اتنی بڑی نیکی ان کے ساتھ کی۔ پھر بھلا وہ اس کا ساتھ کیسے چھوڑ دیں؟ ___ اس ادارہ میں رہ کر یہ ممالک دراصل، اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ برطانیہ ہمارا دوست ہے ___ کہ برطانوی تسلط جائز تھا کہ برطانوی حکمران بڑے "شریف" بڑے "نیک" اور بڑے "مہذب" ہیں۔ اور انھیں "مصلحتوں" کی وجہ سے ان ممالک نے اپنی اپنی "آزادی" کے بعد اپنے آپ کو برطانوی دربار و سرکار سے وابستہ رکھنا ضروری سمجھا۔ یہ "مصلحتیں" جب ڈھکی چھپی تھیں نہ آج ہیں، ہاں جب عام نہ تھیں، آج عام ہیں ___ اور وہ یہ ہیں کہ تاج برطانیہ سے وابستگی برقرار رکھ کر اپنی تحریک آزادی کے کھوکھلے پن کا پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ اور عوام اور سامراج کے درمیان بڑھتے ہوئے تاریخی اور اہم ترین تضاد و اختلافات پر پردہ ڈالا جائے ___ لیکن تابہ کے ___ آخر ڈھیٹ پن کی انتہا ہوتی ہے۔ دولت مشترکہ کے اراکین ہیں کہ جلد از جلد اپنی حماقتوں کا کفارہ ادا کرنے کی بجائے اس کے سالانہ جلسوں میں شرکت کر کے برطانیہ اور اپنی سیاہ کاریوں پر پردہ ڈال رہے ہیں۔ جبکہ یہ پردہ قطعی طور پر خود دولت مشترکہ کی پچھلی کارگزاریوں کی کمان سے نکلے ہوئے تیروں سے چھلنی ہو چکا ہے۔

ابھی حالیہ اجلاس میں اکیس نمائندوں نے شرکت کی تھی، اس کانفرنس کی کاروائی اور ان نمائندوں کی ہیئت کذائی سے جو بات ابھر کر آئی وہ یہ تھی کہ برطانیہ کا اثر و رسوخ اپنی سابقہ مقبوضات میں ختم اور کمزور ہو رہا ہے ___ نیز "غیر جانبدار" ہندوستان اور فوجی معاہدوں میں شریک "سرکش" پاکستان ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں۔ گھانا اور تنزانیہ سے مغرب نواز افریقی ممالک نالاں ہیں۔ جنوبی افریقہ اور رہوڈیشیا کے مسئلہ پر، کچھ ممالک چراغ پا ہیں، ملائیشیا ہر ممبر ملک سے کھلم کھلا ہمدردی کا خواہاں ہے مگر زیادہ تر ممبر ممالک، اس سامراجی نوآبادی کی حمایت کر کے نو آزاد ممالک کی مخالفت مول لینے پر آمادہ نہیں ہیں۔ رہوڈیشیا کے سلسلے میں افریقہ اور ایشیا کے ممالک نے برطانیہ کو تنبیہہ کی کہ وہ نسل کشی کی حامی رہوڈیشیا کی حکومت پر ہر قسم کا دباؤ ڈال کر نام نہاد خود مختاری کا ڈھونگ رچانے سے باز رہے۔ ویٹ نام کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے۔ برطانوی وزیر اعظم ولسن نے مگرمچھ کے آنسو بہا کر امن و آشتی کے لئے رٹے رٹائے فقرے دہرا کر اور ویٹ نام میں جنگی اور جبریہ امن "بحال کرنے کے لئے" "امن منصوبہ" کی امریکی ڈگڈگی بجا کر ویت نامیوں کے جذبۂ بغاوت کو سرد کرنے کیلئے دولت مشترکہ کے اراکین کو آگے بڑھنے کی دعوت دی، مگر پاکستان اور سیلون نے اس دعوت کا رکھائی سے جواب دیا۔ تنزانیہ نے "امن مشن" کے اس ڈھونگ سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کیا۔ اور تو اور خود اس کے نامزد سربراہ ولسن کی کھلم کھلا، [illegible] ہوئی۔ حتیٰ کہ اسے اپنا نام واپس لینے کی پیشکش کرنی پڑی اور [illegible] ویت نامی قوم پرستوں کی خواہش کے مطابق اور شمالی ویت نام، چین اور روس کی مخالفت کے بعد تو یہ "منصوبہ" مغربی سامراجیوں کے بدبودار، گٹر نام "ناکامی" کی "نذر" ہو گیا۔

اجلاس میں دولت مشترکہ کے اراکین ممالک کے معاشی مسائل پر لے دے ہوتی رہی، ایک طرف تو خام مال کی قیمت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ دوسری طرف تیار شدہ مال کی قیمتیں چڑھ رہی ہیں۔ نو آزاد ممالک، خام اور تیار شدہ مال کی قیمتوں میں استحکام چاہتے ہیں۔ نیز ایسے قرضے چاہتے ہیں جن سے واقعی انکی معیشت مستحکم ہو سکے۔ لیکن اگر یہ سب کچھ ہو جائے تو پھر دولت مشترکہ واقعی دولت مشترکہ ہو جائے جو "ایک بات کہنی اور دوسری بات کرنی" کی پالیسی پر چلنے والا برطانیہ بالکل نہیں چاہتا۔ نہ برطانیہ وہ پابندیاں ہٹانا چاہتا ہے جن کے بعد دولت مشترکہ کے ترقی پذیر ممالک برطانیہ کے ساتھ منافع بخش تجارت کر سکیں۔ یہ ہی باتیں کانفرنس میں بار بار ابھر کر آئیں۔

یہ ہیں وہ حقائق، وہ تفصیلات جو اس "بھان متی کے پٹارے" کی ساکھ دن بدن ختم کر رہی ہیں۔ ایسے حالات میں اس ادارہ میں رہنا، کسی بھی طرح مناسب و موزوں نہیں، سامراج کی گلی سڑی اور بدبو چھوڑتی ہوئی لاش پر دلفریب مقبرہ تعمیر کر کے اور مجاور بن کے بیٹھ جانے سے اس لاش میں جان پیدا نہیں ہو سکتی، لاکھ لوبان کی دھونی دی جائے، لاکھ رنگ برنگ کے قیمتی نذرانے چڑھائے جائیں، برطانوی سامراج کے مردہ تن میں جان نہیں آ سکتی۔ لہٰذا اس بھاری تن و توش رکھنے والے سامراج کی لاش کو کاندھوں پر لئے پھرنا اور اس کے ساتھ نتھی رہنے کا جو بھی جواز ہو گا وہ بزدلانہ ہو گا، وہ مکارانہ ہو گا، وہ عیارانہ ہو گا، وہ مصلحت پسند افراد کے ذاتی مفادات کا مظہر ہو گا اور اس کا صداقت، افرایشیائی عوام اور ترقی پذیر ممالک کے روشن مستقبل سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔

افریشیائی کانفرنس

۱۹ر جون کو الجزائر میں بن بیلا کا تختہ الٹ دیا گیا — اور کرنل بومدین نے عنان حکومت سنبھال لی۔

اس انقلاب کا ہونا تھا، افروایشیائی کانفرنس کا انعقاد زیر بحث آگیا — الجزائر کی نئی حکومت نے ببانگ دہل یہ اعلان کیا کہ ۲۹ر جون کو ہونے والی کانفرنس ہو کر رہے گی — اس کے اس موقف کی تائید قاہرہ میں مقیم، چینی وزیر اعظم چواین لائی

انقلاب کی خبر

کانفرنس کے سلسلے میں، لندن میں موجود افریشیائی سربراہوں نے

اور انکے ساتھ ساتھ صدر ناصر نے بھی کی — مگر دولت مشترکہ کی

ملتے ہی — مجوزہ کانفرنس کے التوا کی بات چیت شروع کر دی — اور بظاہر کھلم کھلا دو موقف منظر عام پر آ گئے — کانفرنس ہو گی یا نہیں — عجب امید و بیم کی حالت تھی — گو مگو کا عالم تھا — بین الاقوامی سیاست میں دلچسپی لینے والوں نے تو اس مسئلہ پر باقاعدہ شرطیں تک لگا ڈالی تھیں۔ پریشان کن مسئلہ یہ تھا کہ عام طور پر نہ تو لوگ بومدین سے واقف تھے۔ اور نہ ہی بن بیلا کے متعلق ہی کچھ زیادہ جانتے تھے۔ اوپر سے قاہرہ اور لندن سے آنے والے متضاد اور مختلف بیانات اور زیادہ الجھن پیدا کر رہے تھے۔ رہی سہی کسر مغربی پریس نے پوری کر دی تھی۔ قیاس آرائیوں کا سلسلہ تھا کہ رکنے میں ہی نہیں آ رہا تھا بالآخر کانفرنس کے سلسلے میں پہلے سے قائم شدہ ابتدائی کمیٹی کا بہ ہزار دقت و دشواری الجزائر میں ایک اجلاس ہوا اور بہ اتفاق رائے یہ طے پایا کہ مجوزہ کانفرنس لازماً ۵ر نومبر ۶۵ء کو منعقد کی جائے۔

اس التوار کے متعلق واضح طور پر دو رائیں قائم کی گئی ہیں — پہلی تو یہ ہے کہ اس التوا سے افروایشیائی قوموں کی سامراج دشمن تحریکوں کو شدید نقصان پہنچا ہے — اور دوسری رائے یہ ہے کہ التوار سامراجیوں اور بالخصوص امریکی سامراج کی ریشہ دوانیوں کو ناکام بنانے اور افروایشیائی اقوام کے سامراج دشمن اتحاد کو، مضبوط اور دیرپا بنانے میں مدد دیگا۔ ساتھ ہی ساتھ ایک نکتہ اور توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے — اور وہ یہ کہ الجزائر کی موجودہ انقلابی کونسل اور اس کے سربراہ بومدین کو آخر ایسی کیا مصیبت درپیش تھی کہ انھوں نے بن بیلا کو کانفرنس کے انعقاد سے اتنے تھوڑے عرصے پہلے معزول کر کے خود کانفرنس کا انعقاد ہی ایک مسئلہ بنا دیا۔ جبکہ یہ انقلاب اس سے پہلے یا اس کے بعد بھی لایا جا سکتا تھا — یہ نکتہ ابھی کافی دنوں تک وضاحت اور تشریح کا محتاج رہے گا۔ لیکن فی الحال اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک الجزائر کے موجودہ انقلاب کا سوال ہے۔ یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ الجزائر کی اپنی مثالی جدوجہد آزادی کے زرین مقاصد کو اگر کسی بھی شخصیت یا کونسل نے نظر انداز یا قربان کرنے کی کوشش کی تو اسے الجزائر کے عوام — باشعور اور انقلابی عوام — بھٹی میں تپ کر کندن بن جانے والے عوام سے نبٹنا ہو گا۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں بومدین کا یہ جملہ ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ۔

"موجودہ انقلاب، — انقلاب کے مقاصد کی تکمیل کی طرف ایک قدم ہے —————!"

یہاں اس بحث کو ختم کرتے ہوئے، پہلے دو نکتہ ہائے نظر کی طرف مڑنا چاہیئے کہ یہ سنجیدہ بحث کا مطالبہ کرتے ہیں۔

اصولی طور پر دوسری افروایشیائی کانفرنس جلد از جلد منعقد کرنے پر کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہر ملک کی یہی خواہش ہے کہ دوسری افرایشیائی کانفرنس جلد از جلد منعقد کی جائے تاکہ ایشیا اور افریقہ میں بھوک افلاس وجہالت کے عفریت سے نبٹا جا سکے اور اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان طاقتوں سے لڑا جائے جنکی لوٹ کھسوٹ کی بدولت قدرتی وسائل سے بھرپور علاقے "پسماندہ" اور "غیر ترقی یافتہ" کہلاتے ہیں۔ اور انھیں "پسماندہ" اور "غیر ترقی یافتہ" ممالک کے کاندھوں پر سوار ہو کر کچھ ممالک ترقی یافتہ اور مہذب بن گئے ہیں۔ یوں تو لوٹ کھسوٹ کا یہ سلسلہ پورے افریقہ، ایشیا، اور لاطینی امریکہ میں پھیلا ہوا ہے۔ لیکن اس کا شدید ترین اظہار جنوب مشرقی ایشیا اور افریقہ میں ہی ہو رہا ہے — یہی وجہ تھی کہ صدر سوئیکارنو نے جن کے ملک نے پہلی افرایشیائی کانفرنس میں مہمان نوازی کے فرائض انجام دیئے تھے — پچھلے سال دوسری افرایشیائی کانفرنس کے انعقاد کی تحریک پیش کی جسکا افرایشیائی عوام نے پر زور خیر مقدم کیا۔ اور پچھلے سال دس اپریل سے ۱۵ اپریل تک جکارتہ میں مجوزہ کانفرنس کے انتظامات کئے گئے۔ میٹنگ ہوئی تھی جس میں پاکستان سمیت ۲۲ ممالک شریک ہوئے — یہ کانفرنس کامیاب رہی — اور یہ طے کیا گیا کہ چونکہ پہلی کانفرنس ایشیا میں منعقد کی گئی تھی۔ اس لئے دوسری افریقہ میں ہونی چاہیئے۔ اور افریقی اتحاد کی تنظیم کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ اس مقام کا تعین کرے جہاں ۱۰ مارچ ۶۵ء کو یہ تاریخی کانفرنس منعقد کی جائے۔ افریقی اتحاد کی تنظیم نے الجزائری عوام کی عظیم اور بے مثال قربانیوں کے پیش نظر الجزیرہ کو اس تقریب کے لئے منتخب کر کے تاریخی اعزاز بخشا۔ بعد میں الجزائری حکومت کی درخواست پر کانفرنس کے انعقاد کی تاریخ ۱۰ر مارچ کے بجائے ۲۹ر جون مقرر کی گئی

اس تمام عرصے میں سامراجی ممالک بالخصوص امریکہ اور برطانیہ کانفرنس کو ناکام بنانے کی سازشیں کرتے رہے اور اس "کارِ خیر" میں ہندوستان کے شاستری جی نے اپنے آقاؤں کے نمک کا حق ادا کرنے کی پوری پوری کوشش کی — اور انھیں سامراجی ممالک کی شہ اور اشارے پر۔ ملائشیا۔ جاپان، کانگو اور دوسرے افرایشیائی ممالک کے بھی (جو آزاد تو کہلاتے ہیں لیکن جہاں آج بھی ان ہی کے پروردہ اور، نمک خوار ملازم بر سر اقتدار ہیں۔) ہندوستان کی آواز میں آواز ملا کر سامراجی

باقی صفحہ ۱۴ پر

ایشیا

سعید رضا

تمہیں تو کہتے تھے حکمرانی کا ہے تمہیں کو فقط سلیقہ!
عمل بھی جھوٹے ہیں اہل مغرب تمہاری ہر ایک بات جھوٹی
زمیں نے کروٹ جو اپنی بدلی، بدل گئے وقت کے تقاضے
وہ چونک اٹھا ایشیا ہمارا، وہ دیکھو صدیوں کی نیند ٹوٹی

پھٹی ہوئی آستیں میں بازو دہکتا فولاد بن گئے ہیں!
ہماری صدیوں کی بھوک ہے جو سلگتا لاوا اگل رہی ہے
لکھے تھے لوح جبیں پہ محکومیت کے جو لفظ مٹ گئے ہیں!
ہر ایک بیڑی گری ہے کٹ کر ہر ایک زنجیر گل رہی ہے

بگڑ گئے ہم تو گردشِ روز و شب کا سارا حساب بگڑا
ہوئے جو برہم کبھی تو برہم نظام انجم کو کر دیا ہے
سلگتی سانسوں سے ہم نے جھلسا دیا کبھی برق کا کلیجہ
دہکتی نظروں سے ہم نے سورج کے دل کو چھالوں سے بھر دیا ہے

نہتے ہاتھوں سے ہم نے لاکھوں جگر چٹانوں کے چیر ڈالے
برہنہ پیروں سے ہم نے کانٹوں کی برچھیاں کند کر کے رکھ دیں
پلا کے شہ رگ کا خون ریتی کو ہم نے بارود کر دیا ہے
وہیں سے پیدا ہوئی ہیں توپیں جہاں کدالیں بکھر کے رکھ دیں

وہ اور رہوں گے جو گڑگڑا کر کہیں کہ آزادی بھیک دیدو
یہ حریت تو ہمارا حق ہے کہ جسکو لڑ کر بھی چھین لیں گے
یہ قحط، فلاکتیں، وبا، جہالت، ہمارے تحفے تمہیں مبارک
تم اپنا یہ آسمان لے لو، ہم اپنی ساری زمین لیں گے

قدم اکھاڑیں گے فلپائن سے، فارموسا سے ہم تمہارا
تمہیں نکالیں گے ہند چینی سے، سنگاپور و ملیشیا سے
اب اپنی خونخواریوں کو تسکین تم خود اپنے ہی خوں سے دے لو
لہو کی اک بوند بھی نہ اب پا سکو گے تم سارے ایشیا سے

بقیہ: افرو ایشیائی کانفرنس

ٹھو، ملائشیا ــــ جنوبی ویت نام اور جنوبی کوریا کو افریشیائی کانفرنس میں بلانے کی تجویز پیش کی تاکہ سامراجی ممالک کی غیر حاضری کے باوجود انکی نمائندگی ہو سکے۔ اسی ناپاک مقصد کے حصول کے لئے پچھلے دو تین مہینوں میں ہندوستانی نائب صدر وزیر اعظم، مرکزی وزراء اور ہندوستانی دفتر خارجہ کے افسران بالا بالخصوص افریقی ممالک میں سرگرم عمل رہے۔ انکی پشت پناہی کے لئے امریکہ کے فتنہ پرور ہمفری ہین نے بھی اس عرصہ میں افریقہ کا چکر لگایا اور افریقی ممالک کے سفیروں کے خفیہ اجلاس تک کئے ــــ ان تمام سازشوں کا مقصد یہ تھا کہ جب کانفرنس ہو تو آپس میں پھوٹ ڈال کر اپنا الو سیدھا کیا جائے اور افریشیائی قوموں کے استحصال میں فرق نہ آنے پائے لاکھوں کروڑوں ڈالر کے خرچ اور رشوت کے ذریعہ سامراج نے افریشیائی کانفرنس کے انعقاد کے خلاف اشتہار بازی اور اس کے اندرونی اختلافات کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا اور جب ۱۹ر جون کو الجزائر میں انقلابی کونسل نے بن بیلا کو معزول کرنے کا اعلان کیا تو "آزاد" پریس نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ الجزائر کے خلاف زہر بھرا پروپیگنڈہ کیا اور اس طرح انھوں نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی سوچی ــــ ایک طرف تو دولت مشترکہ کے اس بیان کو خوب اچھالا جس میں کانفرنس کے التوا کی درخواست دی گئی تھی اور اس طرح افریشیائی برادری میں پھوٹ ڈالنے اور اس کو حقیقت کی شکل دینے کی مذموم سازش کی اور دوسری طرف الجزائر جکی حب الوطنی شجاعت اور تدبر نے پچھلے دس سال میں ساری دنیا سے لوہا منوالیا تھا اسے خوب خوب مطعون کیا۔

ان تمام سازشوں کے باوجود افریشیائی ممالک کے عوام کے جذبۂ اتحاد اور سامراج دشمنی سے

مقابلہ کرنے کے عزم نے کانفرنس کو اس آخری مرحلے تک پہنچا دیا تھا لیکن یہ غیر متوقع انقلاب ایک ایسا موڑ تھا جس کا لازمی اندیشہ یہ تھا کہ۔

مغرب کے ایجنٹ ممالک کے سربراہ موجودہ حالات کا بہانہ بنا کر کانفرنس کا بائیکاٹ کر دیتے ــــ اسی لئے متفقہ طور پر کانفرنس کو ۵ر نومبر ۶۵ء تک ملتوی کر دینے کا فیصلہ کیا گیا اور دوبارہ عظیم الجزائری عوام کو ہی اپنی مہمان نوازی کا مستحق قرار دے دیا گیا ــــ اور اس طرح تدبر سے کام لے کر اس گھناؤنی سازش کو ناکام بنا دیا گیا جو افریشیائی عوام کے اتحاد کے لئے نقصان دہ اور سامراج بالخصوص اس کے سربراہ اعلیٰ امریکہ کے لئے مفید ہو سکتی تھی ــــ!

اس طرح اپنی زبردست سیاسی بصیرت کا عملی مظاہرہ کر کے، مشرق نے پھر مغرب کے زہریلے تیروں کے واروں کی کاٹ کر ڈالی ــــ سامراج دشمن ہر فرد و بشر اپنی اور اپنے جیالے رہنماؤں کی نکتہ آفرینی اور معاملہ فہمی کے اس زبردست مظاہرے پر جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔

ایک پیالی دودھ

مصنف: نریندر مترا

مترجم: ایاز عصمی

بنگلہ کہانی

شام کو دودھ والا آیا تو لتیکا نے ایک پاؤ دودھ زائد لے لیا۔

ڈیڑھ سالہ بچی کھوکو کے لئے ڈیڑھ پاؤ دودھ تو لیا ہی جانا تھا۔ بھلا ننھی سی جان صرف پاؤلی اور ساگو دانہ کھا کر کیونکر زندہ رہ سکتی تھی۔ اسی دودھ میں سے تھوڑے سے دودھ کی چائے بھی بن جاتی تھی کیونکہ ولنود کو پاؤڈر کے دودھ کی چائے اچھی نہ لگتی تھی۔ ایک دن جیسے ہی دودھ والا دودھ دے کر گیا تھا تو اس نے بڑی لجاجت سے لتیکا سے کہا تھا۔

"آج مجھے ذرا سے تازہ دودھ کی چائے بنا دو۔"

مگر لتیکا غرا اٹھی تھی "تمہارا تو دماغ چل گیا ہے۔ دودھ بھلا کہاں سے آئے گا جو دودھ لیا جاتا ہے وہ کھوکو کے لئے ہی کافی نہیں ہوتا۔ اب اس دودھ میں سے کاٹ کر تمہیں دے دوں تو وہ دن بھر رو رو کر جان نہ دے دے گی۔"

"اچھا اچھا چیخو نہیں۔" ولنود فرمائش کر کے پچھتانے لگا۔

کچھ دن خاموشی سے بیت گئے۔ لتیکا دیکھ رہی تھی کہ اس کا شوہر دن بھر کام کرتا ہے۔ شدید محنت کی وجہ سے اس کے گال پچک گئے تھے اور کنپٹی کی ہڈی ابھر آئی تھی۔ لتیکا سوچتی "ابھی عمر ہی کیا ہے کوئی تیس سال کے ہوں گے۔ مگر انکی صحت گرتی جا رہی ہے ـــــ اور دوسرے دن لتیکا نے گھر کی چائے کی واحد پیالی جس کا کڑا ٹوٹ چکا تھا اس کے سامنے لا کر رکھ دی۔

"ارے یہ کیا تم نے کھوکو کا دودھ مجھے کیوں دے دیا۔؟"

"نہیں نہیں تم پی لو۔ تمہارے لئے ہی لیا تھا۔ کھوکو کا دودھ بھلا تمہیں کیوں دینے لگی۔ اب تم ہفتے دو ہفتے دودھ ضرور استعمال کرو۔ تمہاری صحت بہت گرتی جا رہی ہے۔"

ـــــ اور ولنود کو چائے کی پیالی دودھ کی ایک آہستہ خرام نہر بہتی محسوس ہوئی۔

"او، لتیکا کو میرا کتنا خیال ہے۔" اس نے جی میں سوچا تو اس کے ذہن پر بارہ سال کی لتیکا ابھر آئی۔ جب وہ پہلے پہل دلہن بن کر اس کے گھر میں آئی تھی۔ اس وقت اس کے چہرہ پر پیلا پن نہ تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی نہ تھیں۔ بلکہ وہ ایک ایسے حسین چہرے کی مالک تھی جس پر دو کنول جیسی آنکھیں جڑی ہوئی تھیں اور پورا چہرہ شاداب پھلواڑی جیسا نظر آ رہا تھا۔ آج وہی شاداب پھلواڑی جیسا چہرہ اور کنول جیسی آنکھیں اس کے ذہن پر آ کر ٹھہر گئی تھیں۔

"مگر اس طرح تو اخراجات بہت بڑھ جائیں گے۔"

ولنود نے "نئی لتیکا" کو اپنے ذہن سے جھٹک کر "پرانی" لتیکا کو سمجھایا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اس کا بندوبست ہو جائے گا۔ آخر کماتے تو تم ہی ہو نا۔ اگر تم پر تھوڑا سا خرچ ہو جائے گا تو کون سی برائی ہو جائے گی؟"

ولنود نے کچھ کہے بغیر پیالی کے لب سے اپنے لب لگا دیئے۔ پاس ہی ولنود کا نو سالہ لڑکا سوپنل بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ سوپنل کے بعد بھی ولنود کے تین بچے ہوئے مگر تینوں بڑی مختصر عمر لے کر آئے تھے اور ماں باپ کو داغ دے گئے تھے۔ کھوکو اسکی پانچویں بچی تھی۔ سوپنل پانچویں درجے کا طالب علم تھا۔ اسے اسکول میں داخل کرانے کے لئے بڑی بھاگ دوڑ کرنی پڑی تھی اور بڑی دقتوں کے بعد اسکی آدھی فیس معاف کرانے میں کامیاب ہوا تھا۔

سوپنل اپنے باپ کو دودھ پیتے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً وہ خود ہی اپنی اس حرکت پر شرما گیا اور اپنا سبق زور زور سے یاد کرنے لگا۔

شیر مذکر ـــــ شیرنی مؤنث

کتا مذکر ـــــ کتیا مونث

بیل مذکر ـــــ گائے مونث

"لو بیٹے سوپنل! تم بھی تھوڑا سا دودھ پی لو۔" ولنود نے بیٹے کو آواز دی۔

"نہیں بابا۔ تم ہی پی لو۔ میں دودھ نہیں پیتا۔" سوپنل نے گردن اٹھائے بغیر ہی جواب دیا۔ اور اپنا سبق رٹنے لگا۔

شیر ـــ شیرنی

کتا ـــ کتیا

بیل ـــ گائے

ٹھیک تو ہے۔ ذرا سا تو دودھ ہے۔ اب وہ اس میں سے کیا پئے تم ہی پی جاؤ میں اسے کسی اور دن دیدونگی۔ اور پھر جب اس کا امتحان شروع ہو گا تو اس کے لئے تھوڑا دودھ تو لینا ہی ہو گا۔" لتیکا اپنے شوہر کی آواز سن کر باورچی خانے سے ہی بولی۔

"نہیں ماں میرے لئے دودھ لینے کی ضرورت نہیں مجھے دودھ اچھا نہیں لگتا۔" سوپنل نے گردن جھکائے ہوئے کہا اور پھر اپنا سبق رٹنے لگا۔

کتا کتیا

بیل گائے

"تمہیں اتنا ذرا سا سبق یاد کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ تم کل شام بھی یہی رٹ رہے تھے ......"

ولنود کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی بیجن جو دیر سے سو کر اٹھنے کا عادی تھا۔ تولئے سے اپنا دھلا ہوا منہ پونچھتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اور ولنود کے سامنے پیالی رکھی ہوئی دیکھ کر دروازے پر ہی ٹھٹک گیا۔ "ارے بھائی۔! آج تم لوگوں

نے چائے بڑی جلدی پی لی ۔"

" مگر دیور جی تمہیں یہ شک کیسے پیدا ہوا ۔ تمہارے بغیر ہم چائے پیتے ہی کب ہیں ۔ ؟" لتیکا بولی ۔

بیجن نے مسکراتے ہوئے کہا " میں سمجھا شاید بھیا آج بہت بھوکے تھے ۔ میرے اٹھنے کا انتظار نہ کر سکے ۔۔ ارے ۔ ۔ ۔ ۔ !"

اس نے ونود کے سامنے کی خالی پیالی دیکھ کر کہا ۔" بھیا تو خالی پیالی ہی چاٹ رہے ہیں ۔ یہ اچھی بات نہیں ہے بھابی ۔ انہیں تھوڑی سی چائے تو انہیں دے ہی دینا چاہئیے تھی ۔"

ونود اور لتیکا نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کہ کہیں بیجن ان پر طنز تو نہیں کر رہا لیکن وہ اس قماش کا لڑکا نہ تھا ۔

' یہ چائے نہیں تھی بیجن ! ' ونود نے مجرموں کے سے انداز میں کہا ۔" دودھ تھا تمہاری بھابی نے میرے لئے ایک پاؤ دودھ لے لیا تھا ۔"

بیجن اپنی بھابی کی طرف دیکھ کر زور سے ہنسا ۔" تو ایسا کہو نہ بھابی کہ تم نے اب بھیا کے لئے گھر کے خرچ سے کپٹ بھی شروع کر دی ہے ۔ کیوں ؟ "

بیجن گھر میں سب سے مذاق کرنے کا عادی تھا ، مگر اس وقت کے مذاق کا ، ونود اور لتیکا دونوں نے برا مانا ۔ بلکہ ونود تو بگڑ بھی اٹھا ۔" کل سے دودھ اسے ہی دیدیا کرو ۔" اسکی آواز تیز تھی اور تلخ بھی !

' اچھا ' لتیکا بھی تلملائی ۔

بیجن نے دونوں کے لہجے کی تلخی اور آواز کی تندی محسوس کر لی اور سمجھ گیا کہ اس کا مذاق انھیں برا لگا ہے ۔" اہو جانے تم لوگوں کو آج کیا ہو گیا ہے کہ ذرا سا مذاق بھی برداشت نہیں ہوتا ۔ ارے میں دودھ کب مانگ رہا ہوں تم تو جانتی ہی ہو بھابی ، کہ دودھ مجھے ، بالکل پسند نہیں ۔ اچھی بھابی مجھے تو بس جھٹ سے ذرا سی چائے دلواؤ ۔"

لتیکا پیالی میں چائے انڈیلنے والی ہی تھی کہ بیجن چیخا " بھابی ! پیالی ذرا اچھی طرح دھو لینا ۔ میں اپنی چائے میں دودھ کی بو بھی پسند نہیں کرتا ۔

لتیکا ایک منٹ خاموش رہی پھر بیجن کی طرف دیکھ کر بولی ۔" دھو تو لیا ہے ۔ پیالی کو ، تم سمجھتے ہو میں تمہیں تمہارے بھائی کی گندی پیالی میں ہی چائے دے رہی ہوں "

دوسرے دن لتیکا دودھ کی پیالی چھپا کر لائی اور ونود اسے برآمدے میں کھڑے کھڑے ہی پی گیا ۔

سونیل اس وقت حفظانِ صحت کی کتاب سے اپنا سبق یاد کر رہا تھا " دودھ صحت کے لئے بہت مفید ہے ۔ " اسے کیا معلوم تھا کہ اس سبق میں اس کے والدین کے لئے کوئی غیر معمولی طنز بھی چھپا ہوا تھا ۔۔ بیجن اس وقت جاگ اٹھا تھا اور اپنے کمرے میں ہی دانتوں کو برش کر رہا تھا ۔ گزشتہ دن کی تلخی کے پیش نظر وہ دودھ پینے کے وقت بھابی کے سامنے جا کر اسکی تکلیف کا سبب بننا نہ چاہتا تھا ۔

ونود نے اس دن دودھ اس اہتمام سے پیا کہ کوئی دیکھ نہ لے ۔ مگر اس کی یہ ہچکچاہٹ زیادہ دنوں قائم نہ رہی ۔ کچھ دنوں کے بعد تو نہ صرف یہ کہ بیوی بھائی اور بیٹے کے سامنے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے دودھ پی لیتا تھا ۔ بلکہ اگر کبھی دودھ ملنے میں ذرا سی دیر ہو جاتی تو چیخ چیخ کر گھر کی چھت سر پر اٹھا لیتا ۔" ارے بھئی دودھ کیا ہوا ۔ کیا مصیبت ہے کہ مجھے باہر جانے میں دیر ہوئی جا رہی ہے کہ دودھ ہے کہ ابھی آکاش سے اترا ہی نہیں ۔۔۔"

" لائی ۔۔ ابھی لائی ۔" لتیکا رسوئی گھر سے ہی چیخی ۔" تمہیں ذرا صبر نہیں ۔ باہر جاتے ہو تو جاؤ ۔ تمہارا دودھ کوئی پی تھوڑے ہی جائے گا ۔"

ونود ایک پریس پروف ریڈر تھا ۔ مگر وہاں تنخواہ بہت کم تھی گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لئے وہ لڑکوں کو پڑھا کر پندرہ بیس روپے کما لیتا ۔ وہ ایک بیمہ کمپنی کا ایجنٹ بھی تھا مگر سال میں ڈھائی ہزار سے زیادہ کی " پالیسی " کبھی نہ دے سکا ۔

آمدنی تو خیر جو تھی سو تھی ۔ مگر باپ دادا کا بخشا ہوا ایک آرام دہ مکان ضرور تھا ۔ جس کی نچلی منزل میں ونود کا خاندان رہتا تھا اور اوپر کی منزل کرائے پر دے رکھی تھی ۔ مگر کرایہ بہت کم ملتا تھا ۔

دودھ کی چاٹ کچھ ایسی منہ کو لگ گئی تھی کہ ونود سوچنے لگا تھا کہ اسے ایک پیالی دودھ پینے کا بھی حق نہیں جبکہ خاندان کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کر رہا ہے ۔"

" ہے ، کیوں نہیں ہے ۔ جبکہ دودھ کی قیمت میں اپنی کمائی سے ادا کرتا ہوں " پھر دودھ پینے میں ہچکچانے یا شرمانے کی کیا بات ہے ؟" اس کا دل اسے کچھ سمجھانے کے بعد ایک سوال کر دیتا ۔

" کچھ نہیں ۔ کوئی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔" وہ اپنے دل کو سمجھا لیتا ۔

" ونود دودھ پیتا رہا ۔ ہفتہ ۔۔ دو ہفتے ۔۔ تین ہفتے گزر گئے اور لتیکا سوچتی رہی کہ شاید ونود اسے دودھ لینے کو منع کر دے ۔ مگر ونود نے اسے منع نہیں کیا ۔

مہینہ ختم ہو گیا ۔ گوالے نے مہینے بھر کے ساڑھے سات روپے طلب کئے تو لتیکا گھبرائی کہ گھر کے اخراجات میں سے کس مد میں کمی کر کے اس کا قرض چکائے ۔ مگر اسکی سمجھ میں کوئی معقول بات نہ آئی ۔ اس نے دودھ والے سے تو کہہ دیا کہ پیسے بعد میں ملیں گے ۔ ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دی اب سے صرف بچی کے لئے ڈیڑھ پاؤ دودھ دے جایا کرے ۔

ونود اپنے کمرے میں کسی کتاب کا پروف پڑھ رہا تھا ۔ اس نے جو لتیکا کو گوالے سے دودھ بند کرنے کی بات کرتے سنا ۔ تو کمرے سے نکل آیا ۔

" دیکھو " اس نے گوالے سے کہا " دودھ بند نہیں ہوگا " پھر لتیکا کی طرف مخاطب ہو کر ۔ بولا ۔ دودھ نے میری صحت پر بڑا اچھا اثر کیا ہے ۔ میرا خیال ہے ایک مہینہ دودھ اور پیئوں ۔"

گوالے کے جانے کے بعد لتیکا اس پر برس پڑی ۔" تم میں عقل نام کو نہیں ہے اب بتاؤ اگلے مہینے دودھ والے کو دینے کے لئے روپے کہاں سے برس پڑیں گے ؟"

ونود نے لتیکا کی باتوں سے اپنی توہین محسوس کی اور چیخ پڑا ۔" تمہیں اس سے کیا ؟ کوئی تمہیں کما کر یہ قرض اتارنا تھوڑے ہی پڑے گا ۔ جو کماتا ہے وہی دے گا دودھ کا دام بھی ، میں تو تمام تمام دن تم لوگوں کے لئے محنت کر کر کے مرا جا رہا ہوں اور تم لوگ ہو کہ مجھے ایک پیالی دودھ پیتے بھی نہیں دیکھ سکتے ۔" مارے غصہ کے دوسرے صبح اس نے دودھ پیا ہی نہیں ۔ اس تمام دن وہ کچھ کھویا کھویا سا رہا ۔ اسے اپنے اندر ایک کمی کا احساس تمام دن ستاتا رہا جیسے اس کا کچھ کھو گیا ہو ۔ وہ گھر بھی رات کے تقریباً دس بجے لوٹا ۔ اور لتیکا نے اس کے سامنے دودھ کی پیالی رکھ دی جس کے اوپر بالائی کی ایک موٹی سی تہہ تیر رہی تھی ۔ بڑی خوشامد اور منت سماجت کے بعد وہ دودھ پینے پر راضی ہوا ۔" لتیکا ۔ !" وہ بولا ۔" میرے لئے کچھ روٹیاں لے آؤ آج مجھے بڑے زور کی بھوک لگی ہے ۔ لتیکا روٹیاں لے کر آئی تو ونود نے اسے تاکید کر دی کہ آئندہ سے دودھ اسے رات کو ہی دیا جائے ۔ اور لتیکا مسکرا پڑی

دوسری رات اس کے سامنے دودھ نہیں آیا ، رکابی میں صرف روٹیاں ہی تھیں ۔" آج دودھ کدھر چلا گیا ؟"

" آج کا دودھ سونیل کو دیدیا ۔" لتیکا نے اسے سمجھایا ۔" بچہ ہے کھانے پر ضد کرنے لگا ۔ میں نے سوچا تم روز پیتے ہو ایک دن وہ بھی پی لے ۔"

" بہت اچھے ۔" ونود مسکرایا ۔ اس کی مسکراہٹ ۔ مگر اسکی مسکراہٹ میں نہ تو بیٹے کو دودھ دینے پر خوشی نمایاں تھی نہ غصہ ۔

کچھ دنوں بعد پھر ایک دن کھانے پر دودھ نہیں تھا ۔ لتیکا نے ونود کے کسی سوال سے پہلے ہی بتا دیا کہ " دودھ بیجن کو دے دیا گیا تھا ۔"

" کیوں ؟" ونود کی آواز قدرے تیز تھی ۔

"اسے کام کی تلاش میں باہر جانا تھا۔ کھانا تیار نہیں تھا۔ میں نے اسے اماوٹ[1] دودھ اور چاول دے دیا۔"

"اچھا ــــ!" دلود نے اچھا ذرا کھینچ کر کہا۔ "پھر کام ملا اسے۔ اسکے لئے جو سیکڑوں سفارشی چٹھیاں لاکر دی تھیں، ان میں سے کوئی کام نہ آئی۔؟"

"نہیں جگہ خالی نہ تھی۔"

"ہاں۔ اس کے لئے کیوں جگہ خالی ہونے لگی۔ جب بغیر کمائی کے ہی دودھ ملنے لگے تو کمانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" اس رات دلود نے کھانا بھی آدھا ہی کھایا ــــ

کچھ دنوں تک دودھ باقاعدگی سے ملتا رہا۔ ایک رات پھر کھانے پر دودھ نہیں تھا۔

سونیل آجکل بڑا ہی شریر ہوگیا تھا۔ اسکول سے لوٹتے ہی رسوئی میں گھس جاتا اور دودھ کی ہانڈی صاف کرکے ہی اٹھتا ہے۔"

"ہوں۔ آج میں مار مار کر اسکی چمڑی ادھیڑ دونگا۔"

اس رات سونیل کی خوب پٹائی ہوئی۔

"تم اس کی زندگی کی خیر چاہتی ہو تو کل سے اسے دودھ کی ہانڈی کے پاس پھٹکنے تک مت دینا۔ سمجھیں۔" دلود غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔

لتیکا خاموش رہی۔

کچھ دنوں تک پھر باقاعدگی جاری رہی۔

"او! کم بخت سونیل آج پھر دودھ چرا کرے گیا اس قدر پٹنے کے بعد بھی یہ ہمت!"

"نہیں نہیں۔ سونیل نہیں آج کا دودھ پڑوسن کی بلی پی گئی۔"

دلود بھڑک اٹھا۔ "پڑوسن کی بلی پی گئی ہے۔" اس نے لتیکا کا منہ چڑایا۔ "تمہیں تو جیسے معلوم ہی نہیں کہ دودھ کتنی قیمتی چیز ہے۔ پڑوس کی بلی دودھ پی گئی ــــ اور تم سمجھ رہی ہو جیسے کچھ نقصان ہی نہیں ہوا۔ تمہیں کمانا پڑے تب نا۔"

میں کمانے تو نہیں جاتی مگر یہ جانتی ضرور ہوں کہ کمانے میں بڑی محنت لگتی ہے۔" لتیکا نے تنگ آکر جواب دیا۔

"دودھ بلی نے نہیں پیا۔ میں اتنی لاپرواہ نہیں ہوں کہ بلی کو دودھ پلا دیتی ــــ دراصل تمہاری "چہیتی" بلی پی گئی ہے . . . ."

لتیکا مسکرائی اسکی مسکراہٹ میں "نئی" لتیکا کی مسکراہٹ کی شیرینی تھی۔" اب بتاؤ کیا کہتے ہو۔؟" لتیکا کے ہونٹوں پر پھر ایک مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"یہ پہیلیاں کیا لے بیٹھیں . . . .؟ آتنی رات گئے یہ مذاق مجھے پسند نہیں پڑوسن کی بلی ــــ میری بلی ــــ جو کہنا ہے صاف صاف کہو۔"

"بات یہ ہے کہ . . . ." لتیکا کچھ رک کر بولی۔ "میری طبیعت پچھلے دنوں سے کچھ اچھی نہیں ہے کچھ کھایا پیا نہیں جاتا۔ اور کھالوں تو ہضم نہیں ہوتا۔ سینے میں جلن سی ہونے لگتی ہے سانس لینے میں بھی تکلیف ہوتی ہے۔ آج پڑوسن نے جو حال سنا تو کہنے لگی۔ "یہ تو اچھی بات نہیں ہے کہ تم جو کچھ کھاتی ہو وہ سب کا سب تیزاب بن جاتا ہے۔ میری مانو تو دودھ پیا کرو ــــ کوئی سہپہر کو تھوڑا سا بھات اور دودھ لے کر بیٹھی ہی تھی کہ سونیل آگیا، اسکول سے چھوٹا تھا بھوکا ہوگا۔ میں نے سب کا سب اسے ہی دے دیا۔"

دلود نے جو یہ سنا تو مارے غصے کے گلاس زمین پر دے مارا۔ بلی ــــ پڑوسن ــ بیماری۔ ذرا سے دودھ کے لئے اس قدر پیچیدہ کہانی گڑھنے کی کیا ضرورت تھی۔ سیدھی طرح کہدیا ہوتا کہ دودھ تم پی گئی ہو۔"

لتیکا نے سمجھا تھا کہ بلی کے بہانے کے بعد جب دلود حقیقت سنے گا تو مسکرا اٹھے گا۔ مگر اس کے چہرے کی رنگت اور چڑھی ہوئی تیوری دیکھ کر تو وہ دنگ ہی رہ گئی

"تم شاید یہ سمجھ رہے ہو کہ بس میرا جی چاہا اور میں تمہارا دودھ پی گئی۔ کیوں؟"

"تو میں یہ کب کہتا ہوں۔ یقیناً پڑوسن نے زبردستی تمہارے حلق میں انڈیل دیا ہوگا۔ . . . .؟" دلود طنزاً بڑے زور سے ہنسا۔

"پی گئی تو پھر کیا ہوا، تم روز پیتے ہو تو کیا میں ایک دن بھی نہیں پی سکتی ــ" لتیکا چڑ کر بولی۔

دلود کھانے کی تھالی چھوڑ کر اٹھ گیا اور ہاتھ دھو کر ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "سچ آخر کار زبان پر آہی گیا۔ یوں کہو نا کہ میرا ایک پیالی دودھ پینا بھی تم لوگوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ گھر کا گھر اسی فکر میں مرا جا رہا ہے کہ میں ایک پیالی دودھ کیسے پی لیتا ہوں۔"

"دودھ کی فکر کرے میری جوتی۔" لتیکا کو بھی غصہ آگیا۔ "تم نے کیا سب کو اپنا جیسا سمجھ لیا ہے۔ کہ چھوٹے بھائی اور بچے کے سامنے غٹا غٹ دودھ چڑھا جاتے ہو اور ذرا نہیں شرماتے ــــ اور جو کسی دن دودھ نہ ملے تو سارا گھر سر پہ اٹھا لیتے ہو"

اتنا سنتے ہی دلود کا پارہ چڑھ گیا، وہ بپھر اٹھا۔ آپے سے باہر ہوگیا اور لتیکا کو مارنے کے لئے لپکا۔ اسے بازو سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔ "شرماؤں کیوں ڈائن دودھ کا دام تو دیتی ہے یا تیرا باپ؟ پیسے تو میں ہی دیتا ہوں پھر کیوں شرماؤں۔ . . . .؟"

"کیا ہوا بھابی!" بپن اپنے کمرے سے چلایا۔ "یہ آدھی رات کو تم لوگوں نے کیا شور مچا رکھا ہے۔ آخر جھگڑا کیا ہے؟"

"کیا کروگے جان کر جھگڑے کی جڑ۔" لتیکا کی آواز تھرتھرائی۔ "آج میں اتنی بھوکی تھی کہ تمہارے بھیا کا دودھ پی گئی۔ بس آفت آگئی۔"

"چھی چھی۔" اتنی ذرا سی بات پر اتنا شور؟" لوگ کیا کہیں گے۔"

شور سن کر سونیل بھی جاگ پڑا اور اتنا تو سمجھ ہی گیا کہ سارا جھگڑا دودھ کا ہے اس نے بپن سے بڑے ہی رازدارانہ انداز میں کہا۔ "کاکا! میں نے ایک دن دودھ پی لیا تھا تو بابا نے مجھے خوب مارا۔ اور کاکا۔ ماں نے مجھے چھڑایا بھی نہیں۔ کیا وہ ماں کو بھی ماریں گے۔؟"

"چلو جاؤ تم چپ چاپ سو جاؤ۔" بپن نے سونیل کو ڈانٹ دیا۔

سونیل تو ڈانٹ سن کر سو گیا۔ مگر دلود اور لتیکا کی آنکھوں کی نیند اڑ چکی تھی۔

دونوں اپنی اپنی جگہ بے چینی سے کروٹ لے رہے تھے۔

صرف ایک پیالی دودھ نے گھر کی فضا کو بگاڑ دیا تھا۔ سسکی بھرتی ہوئی لتیکا بار بار سوچ رہی تھی "نہ میرے پاس کوئی من پسند چیز ہے، نہ گٹ کا کپڑا، نہ زیور اسی پر سوامی جی کے مزاج نہیں ملتے۔ . . . ." اسکی ہر سسکی پہ دلود ایک بے چین کروٹ بدل کر بیزاری سے کہہ اٹھتا۔ "تم لوگ میری جان لے کر رہو گی۔ صبح ہی مجھے کام پر جانا ہے اور اب تک تمہارے چونچلوں سے آنکھ تک نہیں جھپکا سکا۔ صبح کام پر کیا جاؤنگا خاک . . . ." لتیکا اور زور زور سے رونے لگی۔

دلود نے محسوس کیا زیادتی اسی کی تھی۔ وہ اسے منانے کے لئے اپنے بستر سے اٹھا اور اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنے پہلو میں بٹھالیا۔ "یہ سارا جھگڑا ایک قطرہ دودھ کے لئے ہوگیا. . . ." دلود شرمسار تھا۔

"ہاں اسی دودھ کے لئے تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ اب میں مرتے بھی لگوں تو بھی دودھ نہیں پیوں گی۔"

دودھ والا حسب معمول دودھ دے گیا۔ لتیکا نے جلدی جلدی اسے گرم کیا۔ اسے پیالی میں انڈیل کر دلود کے سامنے لے آئی۔

"کیا ہے یہ؟" دلود نے پوچھا۔

"بس چپکے سے پی جاؤ اسے، شام تک اس کا رکنا دشوار ہے۔ کوئی نہ کوئی پی جائے گا اور . . . ." لتیکا آگے کچھ نہ بولی۔

دلود نے کچھ کہے بغیر اپنی باہیں اسکی گردن میں ڈال دیں اور دودھ کی پیالی اس کے

---

[1] آم کے رس کو دھوپ میں خشک کرلیا جاتا ہے، بنگال میں بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے۔

لبوں کے قریب لے گیا۔

"بس بہت ہوا چونچلا" لتیکا مسکرائی۔

"بھابی چائے تیار ہو گئی کیا؟" کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بھجن نے پوچھا اور بھائی بھابی کو اسقدر قریب دیکھ کر واپس جانے لگا۔

"بھاگ کہاں رہے ہو دیور جی؟" لتیکا نے بھجن کو پکارا۔ "تمہارا چہرہ ان دنوں کچھ اترا اترا سا نظر آنے لگا ہے لو آج یہ دودھ تم پی لو۔"

بھجن ہنسا۔ "بھابی تم تو آج کل سینما کی ہیروئن لگ رہی ہو کیوں؟ دودھ تو دراصل تمہیں پینا چاہیئے۔"

"ٹھیک ہے تم پی لو۔ میں سمجھونگی میں نے ہی پیا ہے۔"

اور بھجن نے خاموشی سے دودھ کی پیالی اٹھالی اور کمرے کے باہر نکل گیا

— سونیل بھجن کے کمرے کے پاس والے برآمدے میں چٹائی پر بیٹھا اپنا سبق یاد کر رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ گھر کی فضا میں اچانک تبدیلی کے راز کو پانے کے لئے اپنے والدین کی طرف دیکھ بھی لیتا۔

سونیل کے ساتھ اس کے درجے کا ایک ساتھی فوٹیک بھی تھا۔ فوٹیک پڑوس میں ہی رہتا تھا اس کے گھر والے سونیل کے خاندان سے زیادہ عسرت زدہ تھے۔ اسی لئے وہ درجے میں پڑھائی جانے والی کتابیں بھی نہ خرید سکا تھا اپنی انگریزی کتاب اس نے ایک پرانی کتاب کی دکان سے خریدی تھی۔ جس کے کچھ شروع کے اوراق اس کتاب کے سابق مالک نے شاید امتحان میں نقل کرنے کی غرض سے پھاڑ لئے تھے۔ فوٹیک ان ہی اوراق کی نقل اتارنے سونیل کے گھر آیا تھا۔ اور چٹائی پر بیٹھا سونیل کی کتاب سے نقل کر رہا تھا۔

بھجن دودھ کی پیالی اٹھائے برآمدے میں آیا اور سونیل کو پکار کر بولا۔ "لو بیٹے یہ دودھ پی لو۔"

"نہیں کاکا! تم ہی پی لو۔ تمہیں تو ملتا بھی نہیں۔"

"اس سے کیا ہوا۔ تم نے پیا سمجھو میں نے پی لیا۔"

اور سونیل کوئی بات کہے بغیر دودھ کی پیالی لے کر اپنی جگہ واپس آگیا

فوٹیک اپنی کاپی پر سر جھکائے بڑے انہماک سے انگریزی کے پہلے سبق کی نقل کر رہا تھا اس کے مونڈھے پرندوں کے ڈینے کی طرح اٹھے ہوئے تھے "سنو فوٹیک!" سونیل نے منہمک فوٹیک کے کمزور جسم پر ایک نگاہ ڈال کر کہا۔ "لکھائی تو ہوتی رہے گی پہلے یہ دودھ پی لو۔" فوٹیک نے تشکر آمیز نگاہوں سے سونیل کی طرف دیکھا۔ "شکریہ! بس تم ہی پیو!"

"بدھو! کہہ رہا ہوں تو پی لو۔" سونیل ہنس رہا تھا۔ مگر لہجے میں ایک خلوص تھا

"میں تو روز پیتا ہوں۔ تقریباً روز۔ آج تم پی لو، میں سمجھوں گا میں نے پی لیا ہے۔"

اور فوٹیک نے دودھ کی پیالی اٹھالی۔ ❖

واحد بشیر

مشقِ ستم پر ناز تھا ان کو سوچ کے یہ گھبرائے ہیں
دشتِ جنوں میں جانے کتنے اور مرے ہمسائے ہیں

ہم دیوانے سود و زیاں کا رکھتے ہیں معیار جدا
دل کا درد سے سودا کر کے ہم نے زخم کمائے ہیں

کوہ کن و منصور کا ہم پر کوئی بڑا احسان نہیں
ہم بھی دار سے ہنس کر گذرے کوہ سے بھی ٹکرائے ہیں

یوں تو اپنی نگری میں سب درد کے مارے بستے ہیں
لیکن کتنے لوگوں نے یاں جان کے دکھ اپنائے ہیں

زلف کی ٹھنڈی چھاؤں میں بھی یہ فکر مسلسل رہتی ہے
سر پہ دکھ کا سورج ہوتے سکھ کس کو راس آتے ہیں

کاش ہمارا خون سحر کی سرخی بن کر جگ اٹھے
ہم یہ جان کے خوش ہو لیں گے مر کے نہیں کام آئے ہیں

کیسے کیسے لوگ ہیں جن سے بزمِ جہاں کی رونق ہے
جو راتوں میں جلتی شمعیں دن کو جلتے سائے ہیں

سوزِ تمنا زیست کا حاصل ہے پہلے معلوم نہ تھا
ترک تمنا کر کے یارو کیا کیا ہم پچھتائے ہیں

ایسا بھی اک وقت پڑا ہے مجبوری کی صدیوں میں
دیکھ کے میری سوکھی آنکھیں دریا بھی شرمائے ہیں

وقت تو اندھا راہی ٹھہرا! وقت کو راہ پہ لانا ہے
جن لوگوں نے یہ سوچا ہے وقت کو راہ پہ لائے ہیں

انگریزی سے ترجمہ
رؤف وارثی

مکڑا اور مکھی

ولیم لیبکنیشت

آپ سب ہی اس ٹکی نما پیٹ والے، روئیں دار کیڑے سے واقف ہیں جو دن کی روشنی سے حتی الامکان دور اندھیرے کونوں میں گھسا اپنے قاتل جال بنتا رہتا ہے۔ جس میں جلد باز یا بے وقوف مکھی پھنس جاتی ہے اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ یہ گول گول بلوریں آنکھوں والا کریہہ المنظر کیڑا جسکی ٹانگیں لمبی اور آگے سے مڑی ہوئی ہیں اور جو اپنے شکار کو دبوچنے اور جکڑ لینے میں بے حد مشاق ہیں۔ یہ کیڑا مکڑا ہے۔

دیکھئے یہ اپنی کمین گاہ میں کتنا سرد اور بے حس و حرکت پڑا ہوا شکار کے اپنی حدوں میں پہونچنے کا منتظر ہے۔

ملاحظہ کیجئے کتنی مہارت کے ساتھ یہ اپنے مہلک تانے بانے کو پھیلاتا ہے تاکہ اس میں کمزور مکھی کو پھنسائے اور بے دردی سے شکنجے میں کس لے۔ یہ بدبخت درندہ صفت یہ اطمینان کرنے کے لئے کہ اس کا شکار کسی صورت سے بچ نہ سکے۔ اپنے جال کو تمام فنی اعتبار سے مکمل کرنے میں عموماً بہت زیادہ وقت لگا دیتا ہے۔

پہلے یہ ایک تار پھیلاتا ہے۔ تب دوسرا، تیسرا اور پھر اور — یہ تاروں کو ترچھا کھینچتا ہے اور انھیں دوسرے ترچھے تاروں سے ملا دیتا ہے تاکہ اس کے شکاروں کے عالم نزاع میں مچلنے سے جال ٹوٹنا تو درکنار جال کو معمولی سا نقصان تک نہ پہنچ سکے

آخر کار جالا تیار ہو جاتا ہے۔ دام بچھا دیا جاتا ہے۔ اس سے بچ کر نکلنا، بہت مشکل ہے۔ مکڑا اپنی کمین گاہ کو واپس لوٹ آتا ہے اور تاک میں لگا رہتا ہے حتیٰ کہ ایک بھوک کی ماری مکھی غذا کی تلاش میں اڑتی ہوئی قریب پہنچتی ہے۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ مکھی جلد ہی زیر ہو جاتی ہے۔ اپنی جستجو یا نہ پرواز میں ادھر ادھر پھڑپھڑاتی ہوئی بے چاری اچانک ان تاروں سے ٹکرا جاتی ہے۔ جو اسکے سامنے پھیلے ہوئے ہیں بے بسی سے ان میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ سنبھلنے کی کوشش کرتی ہے اور نڈھال ہو کر گر پڑتی ہے۔ جیسے ہی مکڑا دیکھتا ہے کہ اس کا شکار پھنس چکا ہے یہ گھات سے نکل کر آہستہ آہستہ اپنے خون آشام دہانے اور مڑے ہوئے پنجوں سمیت شکار کے قریب پہنچتا ہے۔ جلدی کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی یہ مہیب بلا اچھی طرح سے واقف ہے کہ اگر ایک بار کوئی بھنگا یا مکھی جال میں پھنس جائے تو پھر بچ کے جانا محال ہے۔ اپنی باہر نکلی ہوئی گہرے سبز رنگ کی آنکھوں سے شکار پر ٹکٹکی باندھ کر گھورتا ہوا اسے عقل و حواس سے بے گانہ کرتا قریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ مکھی سر سے پاؤں تک خوف کے مارے کپکپاتی ہے اس لئے کہ ان تاروں سے خود کو آزاد کر لے جنھوں نے اسے جکڑ رکھا ہے۔ بچنا چاہتی ہے۔ اور ان بے سود، کوششوں میں تمام توانائی کھو بیٹھتی ہے۔

یہ سب بے نتیجہ زور آزمائیاں ہیں اور بے سود کوششیں، جالے کا تانا بانا کستا چلا جاتا ہے اور مکڑا قریب سے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ مکھی اپنے آپ کو مکڑے کے جال سے جسکی باریک لیکن مضبوط جالیوں میں وہ الجھی ہوئی ہے آزاد کرنے کی ہر حرکت کے ساتھ نئے تار اسکو لپیٹے میں لے لیتے ہیں۔ نئے شکنجے اسے جکڑ لیتے ہیں اور آخر کار تھک ہار کر، ہانپتے کانپتے جب مزاحمت کی بالکل سکت نہیں رہتی تو وہ اپنے دشمن مہیب مکڑے کے بازوؤں میں گر جاتی ہے۔

اب یہ بھیانک ڈراؤنی شکل اپنے بالوں سے بھرے پنجے پھیلاتا ہے، شکار کو جکڑ لیتا ہے اور اسے بھینچ ڈالتا ہے پھر یہ اپنے شکار کے تھرتھراتے ہوئے جسم میں منہ لگا کر خون چوسنا شروع کر دیتا ہے۔ ایک بار۔ دوسری بار۔ تیسری بار — اپنی مرضی اور اشتہا کے لحاظ سے! اگر اس سے فی الوقت اسکی خون کی پیاس بجھ گئی تو یہ مکھی کو جسے ابھی اس نے پورے طور پر ہلاک نہیں کیا ہے چھوڑ کر چلا جاتا ہے پھر واپس آتا ہے اور دوبارہ خون چوسنا شروع کر دیتا ہے۔ پھر چھوڑ دیتا ہے اور پھر لوٹ آتا ہے۔ یہاں تک کہ بیچاری مکھی بری طرح سے نچڑ کر رہ جاتی ہے اور اس کے جسم میں نہ تو خون باقی بچتا ہے اور نہ ہی کوئی اور غذا بخش رطوبت — اس میں کافی دیر لگتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات بہت زیادہ دیر کہ بیچاری مکھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

لیکن جب تک اس لالچ کے مارے، خون کے پیاسے کو شکار کے جسم سے ذرہ برابر بھی توانائی مل جانے کی امید رہتی ہے یہ اسے اپنی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ یہ شکار کی زندگی کھینچ لیتا ہے۔ اسکی توانائی چوس ڈالتا ہے، خون پی جاتا ہے اور محض اسوقت اسے بخشتا ہے جب اس میں کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔

تب بے چاری مکھی، مردہ، خون چوس کر سکھائی ہوئی اور تنکے کے ٹکڑے سے بھی ہلکی جالے سے باہر لٹکا دی جاتی ہے۔ ہوا کا پہلا جھونکا اسے دور لے جاتا ہے اور یوں معاملہ تمام ہو جاتا ہے۔

مکڑا تاہم شکم سیر اور مطمئن ہو کر اپنی کمین گاہ میں لوٹ آتا ہے اور خود سے اور دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر — سوچتا ہے کہ آجکل بھی ایماندار لوگ بڑی اچھی طرح گزر کر سکتے ہیں۔

یہ مکھی جسے خون چوس کر سکھایا اور مار ڈالا جاتا ہے، یہ مکھی جو نگل لی جاتی ہے اور جسکا خون دوسروں کے لئے غذائیت فراہم کرتا ہے، تم ہو، تم شہروں اور دیہاتوں میں رہنے والے پرولتاری (محنت کش) تم غلام قوموں، دانشورو، صنعتی مزدورو تم سہمی ہوئی جوان لڑکیو اور کمزور و پامال عورتو، جو اپنے حقوق مانگنے کی جرأت نہیں رکھتی ہو، تم لام پر جانے والے سپاہیو، مختصراً یہ کہ تم تمام لوٹے جانے والے

لوگ —— تم کہ جیسے ہی تمہارا تمام خون چوس لیا جاتا ہے، علیٰحدہ پھینک دیئے جاتے ہو۔ تم جو ملک کا دل، دماغ، توانائی اور قوت ہو اور جنھیں اس کے علاوہ کچھ بھی میسر نہیں کہ شریف بنے رہو اور مفلسی کی حالت میں چپکے سے کسی کونے میں فنا ہو جاؤ جبکہ یہ تمہارا خون پسینہ، تمہاری محنت تمہاری زندگی اور تمہارے خیالات ہیں۔ جنھوں نے انھیں طاقتور بنایا ہے جس پر پل کر وہ موٹے ہوئے ہیں۔ وہ بد تما مکڑے جو تمہارے آقا اور پامال کرنے والے ہیں۔

مکڑے وہ آقا ہیں، وہ سرمایہ دار ہیں، وہ کروڑپتی، لوٹنے والے، سٹے باز دھوکے باز اور بڑے بڑے کٹھ ملا یعنی ہر قسم کے ایسے طفیلی جنکے آمرانہ اقتدار کے پاؤں تلے ہم سب روندے جا رہے ہیں جو ان گندے قوانین کے بنانے والے ہیں جو ہمارے ہی گلے کا طوق بن کر رہ گئے ہیں۔ وہ بربری ہیں جنھوں نے ہمیں غلام بنا رکھا ہے۔ مکڑے وہ سب ہی لوگ ہیں جو ہمارے اوپر پلتے ہیں، جو عوام پر پلتے ہیں یہ وہ ہیں جو اپنے پیروں تلے ہمیں کچل ڈالتے ہیں۔ جو ہماری مفلوک الحالی کا مذاق اڑاتے ہیں اور ہماری بے سود کوششوں پر نفرت سے قہقہے لگاتے ہیں۔

مکھی وہ غریب مزدور ہے جسے تمام وحشیانہ قوانین کے سامنے جھکنا پڑتا ہے جو مالک بنا دیتا ہے۔ اس لئے کہ اس بدقسمت کے پاس اپنا کوئی وسیلہ نہیں ہے اور اسے اپنے اور خاندان کے لئے بہر حال روٹی مہیا کرنی ہے۔ مکڑا وہ بڑی فیکٹری کا مالک ہے جو چھ سے آٹھ مارک روزانہ اپنے ہر مزدور سے کماتا ہے اور جو بڑی فیاضی سے بارہ سے چودہ گھنٹوں کے ایک دن کی اجرت دو سے تین مارک تک دیتا ہے۔ بلکہ بخشتا ہے۔

مکھی وہ کان میں کام کرنے والا مزدور ہے جو اپنی پوری زندگی کان کے دم گھونٹنے والے ماحول میں قربان کر دیتا ہے تاکہ زمین سے ان خزانوں کو چھین لے جو اس بیچارے کے اپنے استعمال کے لئے نہیں ہیں۔ مکڑا وہ حصہ دار ہے جو اپنے حصص کی قیمتیں دگنی تگنی بڑھتے دیکھتا ہے لیکن کبھی مطمئن نہیں ہوتا جو ہمیشہ بڑھتے ہوئے منافع کو اپنی جیب میں ڈالنا چاہتا ہے۔ جو مزدوروں کی محنت کے پھل پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔ اور اگر وہ ذرہ برابر تنخواہ میں اضافہ کا مطالبہ کرتا ہے تو وہ فوج کو بلا لیتا ہے تاکہ "باغیوں" کو گولی سے اڑا دیا جائے۔

مکھی وہ بچہ ہے جسے نہایت کم عمری میں کسی کارخانے کسی ورکشاپ یا گھر پر سخت محنت کرنا پڑتی ہے تاکہ وہ روزی کمانے میں مدد دے سکے۔ وہ غریب والدین بھی مکڑے نہیں ہوتے جو ضرورت کی بنا پر اپنے بچوں کو قربان کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں بلکہ مکڑے تو وہ منحوس سماجی حالات ہیں جو انھیں فولادی شکنجوں کی طرح مجبور کر رہے ہیں کہ وہ اپنے فطری جذبات کو کچل ڈالیں۔ اور خود اپنے خاندان کو کچل ڈالیں۔

مکھی عوام کی وہ سادہ لوح بیٹی ہے جو ایماندارانہ روزی کمانا چاہتی ہے، لیکن اس وقت تک کام حاصل نہیں کر سکتی جب تک وہ اپنے مالک یا کارخانے کے منتظم کی خواہشوں کے سامنے ہتھیار نہ ڈال دے جو اسے استعمال کرتا ہے اور بعد میں عموماً ایک آنے والے بچے کے ساتھ بڑی بے مروتی اور سرد مہری کے ساتھ نکال باہر کرتا ہے تاکہ کوئی "اسکینڈل" نہ بنے پائے۔ مکڑا معزز خاندان کا وہ خوش پوش نکما اور رنگیلا اوباش ہے جو مسکراتے ہوئے معصوم لڑکیوں کو ورغلاتا ہے اور گناہوں کی دلدل میں گھسیٹ لاتا ہے۔ جو حقیقی دنیا وہ سے زیادہ عورتوں کی ممکن ہو سکے بے عزتی کرنا اپنے لئے عزت کا مقام سمجھتا ہے۔

مکھی تم ہو — محنتی کسانو — جو اپنے ہل سے مالداروں زمینداروں کے مالک کے لئے دھرتی کا سینہ چیر رہے ہو۔ تم جو ایسے بیج بو رہے ہو جن کی فصل تم نہ کاٹ سکو گے، تم گر ایسے پھل لگا رہے ہو جنھیں تم نہ چکھ سکو گے۔

مکڑے دیہات کے وہ نمبردار اور وڈیرے ہیں جو اپنے غریب کسانوں کو کرائے کے مزدوروں اور اجرتی کسانوں کو بغیر آرام کے مسلسل محنت کرنے پر مجبور کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی نکمی کاہلانہ زندگی عیش و عشرت میں گزار سکیں۔ جبکہ ہر سال وہ لگان کو اور بڑھا دیتے ہیں اور دیانت دارانہ محنت کی قیمت کو جبراً کم کر دیتے ہیں۔

مکھیاں ہم سب ہی ہیں۔ ہم سادہ لوح اور غریب لوگ کہ ازل سے عبادت گاہوں کی سیڑھیوں پر لرزتے رہے ہیں۔ ہم جنھوں نے مذہبی پیشواؤں کی لعنت کو سجدے کئے ہیں۔ ہم کہ علماء کی توقیر اور انکی تفریح طبع کی خاطر آپس میں جھگڑتے اور ایک دوسرے کو پچھاڑا کئے۔ ہم کہ اپنی کمروں کو خم دیئے زمین پر گھٹنے ٹیکے ہوئے ہیں، ہم جنھوں نے اپنے کچلنے والوں کو اجازت دیدی ہے کہ وہ ناانصافی اور دھاندلی سے حاصل کی ہوئی نعمتوں کو استعمال میں لائیں۔ اس لئے کہ ہم مذہبی تعلیمات کے اعصاب سلا دینے والے اثرات کے ذریعے ذہنی طور پر مفلوج کر دیئے گئے ہیں۔

مکڑے وہ سیاہ قباؤں میں ملبوس مکارانہ آنکھوں والے پیشوا ہیں جو پختہ ایمان والوں کے سادہ دلوں کو اپنی ملامتی تعلیمات کے شیشے میں ڈھال لیتے ہیں۔ جو عاجزی اور غلامانہ ذہنیت کو فروغ دیتے ہیں۔ وہ جو روحوں کو زہر آلود کرتے ہیں اور جیا پولینڈ میں ہوا، قوموں کو تباہ کر ڈالتے ہیں۔

مختصر یہ کہ مکھیاں، کچلے ہوئے، غلام بنائے ہوئے اور لوٹے جانے والے لوگ ہیں اور مکڑا نفرت انگیز فکر، مطلق العنان اقتدار اور آمریت ہے خواہ اس کا کوئی بھی روپ ہو۔

اگلے وقتوں میں مکڑے اپنا جال بڑے بڑے محلوں اور قلعوں پر سے پھینکا کرتے تھے۔ لیکن آجکل اپنی رہائش گاہ کے لئے وہ صنعتی زندگی کے بڑے مرکزوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ جو ہمارے زمانے کے خوش قسمتوں کی عشرت گاہیں ہیں۔ صنعتی شہروں میں یہ خاص طور پر ہوتے ہیں۔ لیکن ویسے دیہاتوں میں بھی رہتے ہیں اور چھوٹے دیہاتی شہروں میں بھی —— ان کو ہر ایسی جگہ ڈھونڈا جا سکتا ہے، جہاں لوٹ کھسوٹ پلتی ہے، جہاں مزدور، بے سر و ساماں پرولتاری چھوٹا دستکار اور ساہوکار کے جنگل میں پھنسا ہوا چھوٹا کسان —— ان کی کبھی نہ پوری ہونے والی حرص و آز اور لالچ میں بے رحمی سے جکڑے ہوئے ہیں۔

یہ کہیں بھی ہوں، شہر میں یا دیہات میں۔ ہر جگہ ہم بیچارے کیڑوں کو اپنے دشمن کے جالے میں پھنسا اپنی بے سود کوششوں سے نڈھال ہوتے دیکھتے ہیں۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کس طرح وہ ہانپنے لگتے ہیں۔ مرجھا جاتے ہیں اور فنا ہو جاتے ہیں۔

کمزور اور ناتواں مکھیوں کی بے رحم مکڑوں کے خلاف صدیوں کی جد و جہد میں کتنے ہی بھیانک المیوں نے جنم لیا۔ یہ لہو میں ڈوبی ہوئی، دکھوں اور مصیبتوں کی تاریخ ہے۔ لیکن اسے کیوں دہرایا جائے۔ ماضی مر چکا ہے۔ آؤ حال اور مستقبل کی بات کریں۔

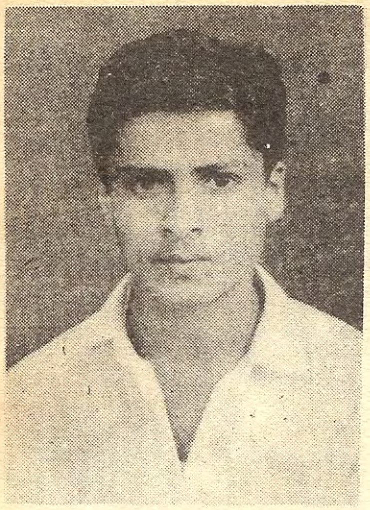
آؤ ہم اس جد و جہد کو قریب سے دیکھیں جو مکھیوں اور مکڑوں میں آجکل جاری ہے۔ آؤ ہم اس کے پس پردہ حالات کو سمجھیں۔ آؤ ہم سب مکھیاں اس جالے کی بناوٹ کا مطالعہ کریں جو ہمارے دشمن ہمارے لئے بُن رہے ہیں۔ آؤ ہم ان ہتھکنڈوں کو ننگا کر دیں اور سب سے پہلے ہم سب ایک ہو جائیں۔ ہم جو علیٰحدہ علیٰحدہ بہت کمزور ہیں اور اپنے گرد بنے ہوئے جال کی دھجیاں بکھیرنے کی سکت نہیں رکھتے۔

آؤ ہم اپنی زنجیریں توڑ ڈالیں۔ اپنے دشمنوں کو انکی کمین گاہوں سے نکال باہر کریں۔ اور ہر سمت روشنی پھیلا دیں۔ علم کی جگمگاتی روشنی تاکہ آئندہ کوئی گندی بلا اندھیروں کے سائے میں، اپنے تلاطم و غضب سے کوئی جال نہ رکھے۔

اے مکھیو! کاش تم چاہو —— بس ارادہ کر لو تو اعظم ہو جاؤ گی۔

یہ ٹھیک ہے کہ مکڑے آج طاقتور ہیں۔ لیکن وہ گنتی کے صرف چند ہیں۔ تم مکھیو! اگرچہ کہ تمہاری نہ ہی کوئی حیثیت ہے نہ ہی اثر۔ لیکن تم فوج کی فوج ہو —— تم جو زندگی ہو، تم جو کائنات ہو —— کاش تم ارادہ کر لو! —— اگر تم ایک ہو جاؤ تو اپنے پروں کی پھڑپھڑاہٹ میں ہی تم تمام تاروں کو کاٹ ڈالو، ان تمام جالوں کو تہس نہس کر دو جن میں تم آج محبوس ہو۔ جنھیں تم کتنی مایوسی سے جد و جہد کرتی ہوا اور بھوک سے مرجاتی ہو۔ یہ تمہاری بدبختی اور تباہی ایک داستان پارینہ ہو سکتی ہے اگر تم صرف ایک بار ارادہ کر لو!

لہٰذا۔ ارادہ کرنا سیکھو!!



احفاظ الرحمان

پیاسے ہیرے

سکینہ فضل بھائی بڑی دیر سے اپنے فلیٹ کی بالکنی میں کھڑی ہوئی نیچے گلی میں جھانک رہی تھی۔

بظاہر گلی میں ایسی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی جو اسکی دلچسپی کا سبب بنتی۔ سامنے والی پان کی دوکان کے آگے پڑے ہوئے بنچ پر تین آدمی بیٹھے حسب معمول فلموں کی باتیں کر رہے تھے۔ شانِ مسلم ہوٹل کا ملباری مالک گراموفون میں چابی بھرنے کے بعد اس پر کوئی پرانا گھسا پٹا ریکارڈ چڑھا رہا تھا۔ اس کے پاس چند گنے چنے ریکارڈ تھے جنھیں سنتے سنتے لوگوں کے کان پک چکے تھے۔ دائیں طرف سندھن بڑھیا ایک ٹوکری میں کچے امرود، بادام اور بیر بھرے بیٹھی تھی۔ اور چھوٹے چھوٹے بچے اسے گھیرے ہوئے تھے۔ نیچے والے فٹ پاتھ پر سیکنڈ شفٹ میں پڑھنے والے نوعمر طالب علم کرکٹ کھیل رہے تھے۔

سکینہ فضل بھائی جس چیز کو اتنی محویت سے دیکھ رہی تھی وہ گنے کا رس نکالنے والی ایک عام سی مشین تھی جسے وہ پچھلے ڈیڑھ سال سے اسی جگہ، اسی ریڑھے پر نصب دیکھتی چلی آئی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پیچھے اسٹول پر بیٹھا ہوا کالا کلوٹا بنگالی اس کا مالک تھا۔ اس نے اپنے گاہکوں کے لئے آگے کی طرف ایک بنچ ڈال رکھا تھا۔ رات کو اپنا کاروبار بند کرتے وقت وہ اسٹول اور بنچ کو مشین کے نیچے ڈال کر اس کے گرد ایک موٹی سی زنجیر لپیٹ کر اس میں تالا لگا جاتا۔ اور اسے صبح ٹھیک آٹھ بجے آ کر کھولتا۔ اس کے لئے چاہے یہ مشین دنیا کی سب سے قیمتی چیز رہی ہو لیکن سکینہ فضل بھائی کے لئے کل تک تو وہ ایک معمولی سی غیر اہم چیز تھی۔

اور آج : : : وہ اچانک اس لئے اہم ہو گئی کہ اس کا پہیہ تیزی سے گھوم رہا تھا : !!!

مشین کا پہیہ تیزی سے گھوم رہا تھا اور سکینہ فضل بھائی کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا : : : : اس کا جسم سلگ رہا تھا اور اس کی آنکھیں دہک اٹھی تھیں : : : رولر میں کچلے ہوئے گنے ایک جھٹکے سے آگے کی طرف نکل رہے تھے اور سامنے والے خانے سے ان کا تازہ تازہ مہکتا ہوا رس نکل کر چیل کی ڈھلوان نالی پر پھسلتا ہوا نیچے رکھے ہوئے جگ میں گر رہا تھا۔ اور سکینہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اسکی مٹھاس اسکی روح میں گھلتی جا رہی ہو۔

اس سے پہلے مشین کا پہیہ اتنی تیز نہیں گھومتا تھا اور نہ کبھی اس کا دل یوں دھڑکتا تھا!

اور آج پہیہ اس لئے تیزی سے گھوم رہا تھا کہ اسے گھمانے والے بوڑھے بازوؤں کی جگہ اب مضبوط بازو لے چکے تھے : : : : یہ غالباً اس کالے کلوٹے بنگالی کا نیا ملازم تھا، خاکی رنگ کی پرانی پتلون پر اس نے بند گلے کی میلی سی بنیان پہن رکھی تھی چوڑی چھاتی، ٹھوس سڈول بازو، تنی ہوئی گردن، مضبوط ٹانگیں اس پر نکلتا ہوا قد : : : ایسا مقناطیسی جسم جسے دیکھتے ہی اس سے لپٹ جانے کو جی چاہے۔ سکینہ نے اسے پہلی بار آج صبح نو بجے کے قریب دیکھا تھا، اس وقت وہ اپنا سر جھکائے بغیر اتنی آسانی سے پہیے کو گھما رہا تھا جیسے رولر کے نیچے گنے کی بجائے روئی کے تکلے ہوں پہلے پہل تو وہ یہ سمجھی کہ شاید وہ خالی مشین چلا رہا ہے۔ مگر جب پانچ چھ گنے بیک وقت ایکدم جھٹکے سے آگے کی طرف نکلتے چلے گئے تو اسے بڑی حیرت ہوئی ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے ہاتھوں میں ایک بھاری مشین کے ہینڈل کی بجائے کسی کھلونے کی چابی ہو۔ ۔ ۔ ۔ اس کے چوڑے چکلے جسم پر نظر پڑتے ہی سکینہ کے خون میں مقناطیسی لہریں سی دوڑ جاتی تھیں۔ ۔ ۔ ۔ اور اس کا جی چاہتا تھا کہ دوڑتی ہوئی نیچے جا کر اس کے چوڑے چکلے مضبوط سے سینے سے لپٹ جائے۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ اپنے گٹھیلے بازو اس کی کمر کے گرد ڈال کر اسے اتنے زور سے دبائے۔ اتنے زور سے دبائے کہ اس کا انگ انگ چیخ اٹھے اور وہ دبی دبی سسکاریاں بھرنے لگے

جب سے اب تک وہ متعدد بار بالکنی پر آ چکی تھی ـــ اور اب اس وقت وہ پھر وہیں آ کھڑی ہوئی تھی۔ پہیے کی حرکت کے ساتھ ساتھ اس کے بازو کی مچھلیاں ادھر ادھر تھرک رہی تھیں اور سکینہ کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اور اس کے جسم کی تمام حسرتیں، تمام آرزوئیں آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں۔

مشین کا مالک کالا کلوٹا بنگالی کتنا خوش اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس کا پہلا ملازم کس قدر کمزور اور سست تھا۔ دو چار منٹ میں ہی ہانپ جاتا تھا۔ گنے رولر میں پھنسے رہتے اور وہ ہینڈل کو بار بار جھٹکا دے کر پہیے کو آگے چلانے کی کوشش کرتا رہ جاتا : اور بے صبر گاہک انتظار کرتے کرتے جھنجلا جاتے ـــ اس کا جسم بالکل سوکھا اور بے جان تھا : : : بالکل فضل بھائی کے جسم کی طرح : فرق صرف یہ تھا کہ فضل بھائی موٹا اور بھدا تھا لیکن جان اس میں بھی نہیں تھی : جب وہ چلتا تو یوں لگتا جیسے گوشت کا پہاڑ رینگ رہا ہو، اپنے فلیٹ تک پہنچنے کے لئے جب پہلے ہی فلور پر تھا اسے صرف بیس سیڑھیاں طے کرنی پڑتی تھیں : لیکن اسی میں اسکی جان نکل جاتی : ہانپتا کانپتا جب وہ کمرے میں گھستے ہی خود کو بیڈ پر گرا دیتا اور اپنی بے ڈھنگی توند کو ادھر ادھر حرکت دیتے ہوئے گہرے گہرے سانس لینے لگتا تو سکینہ کو بالکل زہر لگتا : اس کا بس چلتا تو وہ اسکی توند کو چھیل ڈالتی :

وہ کبھی اپنی خوشی سے اسکے ساتھ باہر نہیں جاتی تھی : کیونکہ لوگ جب انھیں دیکھ کر قہقہے لگاتے تو اس کا جی چاہتا کہ اسے یہیں کسی بس والے کے نیچے دھکا دے کر بھاگ نکلے : لوگ ان کے پاس سے گزرتے ہوئے مختلف قسم کے ریمارکس پاس کرتے

”کتنا موٹا مشٹنڈا ہے !“

”کتنی خوبصورت عورت ہے !!“

”اسکی ناک کتنی بھدی ہے !“

”اسکی آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں !!“

”ہو ہو : : : : ہا ہا !“

"ہائے ہائے !!"

شادی سے پہلے اس قسم کے آوازے سن کر اسکی روح جھوم اٹھتی تھی بظاہر تو اسکی تیوریاں چڑھ جاتیں۔ لیکن اندر سے اس کا جی چاہتا کہ کوئی اور چھیڑے . . . . اور چھیڑے۔

لیکن شادی کے بعد جب وہ فضل بھائی کے ہمراہ کہیں جاتی اور راہ چلتے، آوازے سنائی دیتے تو اس کا جسم انگاروں پہ لوٹنے لگتا۔ اس کا دل اپنی بے بسی پر رو پڑتا اور اسکی روح اپنی بے چارگی اور مظلومیت کا اندھیرا چھا جاتا۔ حالانکہ اسے زمانے بھر کی راحتیں میسر تھیں۔ لیکن پھر بھی اسے محسوس ہوتا جیسے فضل بھائی زمانہ قدیم کا کوئی سوداگر ہو اور وہ اسکی زر خرید لونڈی! اور اس نے زندگی کی تمام رنگینیاں اس سے چھین لی ہوں۔ پھر وہ دل ہی دل میں اپنی قسمت کو اور اپنے ماں باپ کو کوسنے لگتی۔ جنھوں نے اسے گوشت کے ایک ڈھیر کے حوالے کر دیا تھا۔.. اور گوشت بھی کیا ــ نرم، بوڑھا اور سرد!!!

اپنی سہیلیوں میں وہ سب سے زیادہ حسین تھی۔ اسکول کے زمانے میں لڑکیوں کو اس سے دوستی کی حسرت تھی۔ کھیلوں کے دوران ہر لڑکی کی یہ خواہش ہوتی کہ وہ سکینہ کی پارٹنر بنے ــ گھر میں۔ اسکول میں، راستے میں ہر جگہ اسے سہیلیاں گھیرے رہتیں۔ اور لڑکے تو اس سے اس درجہ متاثر تھے کہ اسے چھیڑنے کی ہمت بھی نہ کر پاتے تھے۔ حالانکہ ان میں سے بعض کو وہ بہت پسند کرتی تھی۔ لیکن اپنے حسن کے شدید احساس اور خود پسندی کی وجہ سے ان میں سے کسی کی ہمت افزائی نہیں کی . . . . . شاید اس لئے کہ اسے ایک ایسے شخص کے پلے پڑنا تھا جسے وہ رتی برابر بھی پسند نہیں کرتی تھی۔

ڈیڑھ سال پہلے جب اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کا ہونے والا شوہر ایک بہت بڑے جنرل اسٹور کا مالک ہے اور بہت دولتمند ہے تو وہ کھل اٹھی تھی اور اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کے سارے سپنے سچے تھے۔ پھر اس نے دل ہی دل میں ان تمام خواہشات کی تکمیل کر لی تھی جنھیں باپ کی غربت کی وجہ سے وہ زبان پر بھی نہیں لا سکتی تھی . . . . اس کے سامنے رنگ ہی رنگ بکھر گئے۔ اور اس کا ذہن اپنی گندی گلیوں سے اوپر . . . . بہت اوپر اڑنے لگا۔ اور تمام جانے پہچانے لوگ نظر آنے لگے ــــ وہ تمام حسرتیں جن پر اس کے باپ کے معمولی سے خوانچے نے اندھیرے کی مہر لگا دی تھی سیٹھ فضل بھائی کے جنرل اسٹور کی روشنی میں جگمگانے لگیں۔

شادی کے بعد واقعی اس کے سامنے رنگوں کی دنیا سمٹ آئی، لیکن فضل بھائی کے بے ڈھنگے بوڑھے اور سرد جسم کے سامنے سارے رنگ پھیکے پڑ گئے ــ پھر اسے معلوم ہوا کہ سپنوں کی دنیا ہی زیادہ حسین تھی۔ جھوٹ وہاں بھی تھا لیکن ایسا جو خوشی کے چند انمول لمحے اسکی زندگی کے دامن میں بھر جاتا۔ کوئی ہفتہ ایسا نہ جاتا جب فضل بھائی اسے کوئی نیا لباس یا زیور لا کر نہ دیتا ہو۔ لیکن اسکی روح بیل کی طرح مرجھا چکی تھی جیسے ایک عرصہ سے پانی نہ ملا ہو . . . . اور اب چاہے جتنا پانی ڈالو اس میں شگوفے نہیں پھوٹیں گے!!

یوں تو جب وہ اپنی سہیلیوں سے ملتی تو اپنے عیش و آرام کا اظہار بڑھا چڑھا کر کرتی اور اسکی گفتگو میں احساس برتری جھلکنے لگتا۔ لیکن اندر ہی اندر اس کا دل روتا رہتا ــــ وہ اپنا غم کسی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن زبان سے اس نے کبھی کچھ نہ کہا تو کیا ہوا، وہ اپنی آنکھوں کو تو نہیں روک سکتی تھی . . . . جاننے والے جانتے تھے کہ شادی کے ڈیڑھ سال بعد بھی وہ بے اولاد کیوں ہے؟

نیچے گلی میں گنے کی مشین کا مالک کالا کلوٹا بنگالی بڑے اطمینان سے اپنے ایک گاہک کے لئے گلاس میں رس بھر رہا تھا۔ اور اس کا نیا ملازم بڑی مستعدی سے ہنڈل گھما رہا تھا۔ پہیے کی حرکت کے ساتھ ساتھ اسکے بازوؤں کی مچھلیاں ادھر ادھر تھرکتیں اور ایک ایک جوڑ نمایاں ہو جاتا۔ سکینہ فضل بھائی کی آنکھیں دہک اٹھتیں اور روح ایک جانی پہچانی سی لذت محسوس کرنے لگتی . . . . . وہ بڑی حسرت سے اس کے جسم کو تکتی رہی جو آنکھوں کے ذریعے اس کے انگ انگ میں سما کر اس کے لہو کو گرما گیا تھا . . . . . پھر جس جسم کو اسکی آنکھیں چھو رہی تھیں اس کے لمس کا احساس اسے قریب سے دیکھنے کی خواہش، اندھیاری کر اس کے ذہن پر چھا گئی۔

"اے شربت والے!" نیچے کی طرف جھکتے ہوئے اس نے آواز دی۔

"جی بیگم شاب!" بنگالی نے اسکی بالکنی کی طرف سر اٹھاتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ اس فلیٹ سے پہلی بار کسی نے اسے آواز دی تھی۔

"دو گلاس بھیجو۔! اچھا والا ہاں!!" اندر باورچی خانے میں اسکی ملازمہ موجود تھی لیکن اس نے اسے نظر انداز کر دیا تھا۔

چند لمحے وہ بالکنی پہ کھڑی رہی اور جیسے ہی بنگالی نے اس نئے ملازم کو دو گلاس بھر کر دیتے ہوئے اوپر اس کے پاس جانے کا اشارہ کیا اسکے دل کا چور چہرے پر ابھر آیا اور دل کی دھڑکن تیز تر ہوتی چلی گئی . . . دھک . . . . دھک . . . . دھک اسے ایسا لگا جیسے اس کے دل کی آواز ہر ایک تک پہنچ رہی ہے۔ اپنے سانس کو معمول پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ ہر شخص اپنے کام میں مصروف تھا ــ اس نے سوچا، یہ کون سی غیر معمولی بات ہے۔ لوگ اپنی ضرورت کی چیزیں اوپر منگواتے ہی رہتے ہیں۔!

پیشانی سے پسینے کے قطرے پونچھتے ہوئے وہ کمرے کے اندر آئی اور مسہری پر گر پڑی! اس کے ریفریجریٹر میں ہر ذائقے کے اسکوائش موجود تھے۔

دروازے پر دستک ہوئی،

"آجاؤ!" اس نے لیٹے لیٹے ایک بھرپور انگڑائی لی دروازہ کھلا ہوا تھا وہ اندر آگیا۔

"یہ گلاس کدھر رکھوں بیگم صاحبہ!"

"سامنے میز پر رکھ دو!" اس نے لاپرواہی سے میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔

وہ میز پہ گلاس رکھ کر جانے لگا۔

"اپنے گلاس بھی واپس لے جاؤ!" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"آپ پی لیں بیگم صاحبہ۔ میں بعد میں آ کر لے جاؤں گا۔!" وہ بڑا گھبرایا ہوا اور مرعوب سا نظر آ رہا تھا۔

"نہیں۔ میں انھیں خالی کر دیتی ہوں!" وہ اٹھ کر شیشے کی الماری تک گئی ــ "تم جب تک بیٹھ جاؤ۔!"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا دوڑ گیا اور وہ جھجکتے جھجکتے نرم لچکیلے صوفے پر بیٹھ گیا، الماری میں شیشے کے دو نازک سے خوبصورت گلاس نکالتے ہوئے وہ اسے چور نظروں سے دیکھنے لگی . . . . قریب سے اس کا جسم اور پرکشش دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بڑی حیرانی سے کمرے کی ایک ایک چیز کو تک رہا تھا۔ ریڈیوگرام صوفے سنگھار میز، مسہریاں فرشی قالین، پردے، قد آدم آئینے۔ کسی چیز پر اسکی نظریں نہیں ٹک رہی تھی ــــ سکینہ فضل بھائی نے اپنے گلاسوں میں رس الٹ لیا اور اس کے گلاس واپس کر دیئے۔

"دیکھو روزانہ دو گلاس ادھر دے جایا کرو!

"جی بیگم صاب۔!" وہ ہکلایا۔ اس کے چوڑے چکلے اعضا میں ایک خاص چمک تھی جن پر نظر پڑتے ہی اس کے خون کی گردش تیز تر ہو گئی۔ اور اس کے دل میں انھیں چھونے اور ان کی مضبوط گرفت میں مچلنے کا جذبہ شدت سے ابھر آیا۔

پیاس سے اسکی زبان خشک ہو گئی!

میز پہ گنے کے مہکتے ہوئے رس سے بھرے ہوئے دو گلاس رکھے تھے، لیکن وہ انھیں ابھی پینا نہیں چاہتی تھی . . . . شاید اس لئے کہ وہ گنے کا رس پینے کی عادی

نہیں تھی اور اب تک اسکوائش پیتی چلی آئی تھی۔!!!

اس نے اپنے پرس میں سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اسکی طرف بڑھایا

"باقی پیسے تم رکھ لینا۔ اور دیکھو کل بھی دو گلاس لے آنا!"

"مہربانی بیگم صاحب!" خوشی کے مارے اسکی آواز کانپ رہی تھی۔ اور جب اس نے نوٹ لینے کے لئے ہاتھ بڑھائے تو ہاتھ بھی کانپ رہے تھے۔

"تم شاید آج ہی سے یہاں کام کر رہے ہو۔؟"

"جی بیگم صاب!"

"پہلے کہاں کام کرتے تھے؟"

"جی، فضل بھائی جنرل اسٹور میں"

"کیا؟" وہ ایک دم چونک پڑی۔

"فضل بھائی جنرل اسٹور"

"تو وہاں سے کام کیوں چھوڑ دیا"

"سیٹھ نے نکال دیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں مال چراتا ہوں۔ میں حرام کے مال پر لعنت بھیجتا ہوں بیگم صاب! میں نے اسے یقین دلانے کی بہت کوشش کی، قسمیں کھائیں اپنے بوڑھے ماں باپ اور بچوں کا واسطہ تک دیا۔۔۔۔ لیکن بیگم صاب اس کو بالکل رحم نہیں آیا!"

سکینہ فضل بھائی نے گہری سانس لی۔ "اچھا۔ کل بھی دو گلاس لے آنا۔ ہاں!"

وہ گلاس اور نوٹ لے کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔۔۔۔ لیکن دروازے کے ہنڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ پیچھے کی طرف مڑا ہی تھا کہ دروازے پر باہر کی طرف سے دباؤ پڑا، وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا، سکینہ چونک پڑی۔

"ہوں۔ ہوں۔ ہوں۔ سانپ کی پھنکار جیسی گہری سانس لیتا ہوا سیٹھ فضل بھائی اندر داخل ہوا۔۔۔۔ اور ٹھٹک کر رہ گیا۔ چند لمحے وہ گم سم کھڑا رہا اور پھر سکینہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"مجید تم ادھر کہاں۔؟"

"سلام والیکم سیٹھ صاب۔!" اس نے بوکھلائے ہوئے خوشامدانہ لہجے میں جواب دیا "ادھر ہم نیچے گنے کی مشین پر کام کرتا ہے، ہم بیگم صاب کے لئے رس لایا تھا بیگم صاب بہت اچھا ہے۔۔۔۔ ہم کو پانچ روپیہ بخشش دیا۔!"

فضل بھائی نے معنی خیز نظروں سے میز پر رکھے ہوئے گلاسوں کی طرف دیکھا۔ اور پھر سکینہ کے پیاسے چہرے کی طرف، اسے یوں لگا جیسے وہ اسکی آنکھوں میں کچھ تلاش کر رہا ہو۔ خاموشی سے تھوک نگلتے ہوئے وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"ہوں!" فضل بھائی نے اسے کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"تو اب تم ادھر کام کرتا ہے؟"

"سیٹھ! ہمارا کوئی قصور نہیں تھا۔۔۔ وہ سالا رحیم سب گڑبڑ کرتا تھا اسی نے ہم کو بہکایا۔ تھا!" وہ بڑی عاجزی سے گڑگڑایا۔

"اچھا اچھا۔۔۔۔ ہم کو تمہارا بال بچہ پر رحم آتا ہے۔ تمہارا ماں باپ بوڑھا ہے۔۔۔ تم ابھی اسٹور جاؤ اور کام کرو!"۔۔۔۔ فضل بھائی کی آنکھوں کے سامنے مجید کا کسرتی بدن اور اپنی بیوی کی آنکھیں گردش کر رہی تھیں۔

"لیکن سیٹھ!" وہ ہکلایا۔

"تم ہم کو بیس روپے جیادہ دیں گا!" فضل بھائی کی آنکھیں سکینہ کے چہرے پر گڑی رہیں، جو بار بار اپنی پلکیں جھپکا رہی تھی اس کا جی چاہا کہ فضل بھائی کے منہ پر تھوک دے۔

"لیکن سیٹھ۔۔۔۔"

"چلو تیس روپے بڑھا دیتا ہے۔۔۔ بس!"

"لیکن سیٹھ!"

"اب جیادہ بات مت کرو۔ تم ہمارا پرانا آدمی ہے، ہم تم کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔۔۔ ہم چالیس روپیہ جیادہ دیں گا۔!" سکینہ کو یوں محسوس ہوا جیسے فضل بھائی اس کی آنکھوں کی بولی بول رہا ہے۔

"لیکن سیٹھ ہم تو یہ کہتا تھا کہ کل سے آئے گا۔ آج کا مزدوری۔۔۔"

"وہ ہم دیں گا تم کو، بس اب تم جاؤ۔!" فضل بھائی نے تحکمانہ لہجے میں اسے ڈانٹا۔

"مہربانی سیٹھ صاب۔۔۔۔ بہت بہت مہربانی!" وہ خوشامد سے تقریباً جھکتا ہوا بولا "ہمارا بال بچہ تم کو دعائیں دے گا۔ ہم بے ایمان نہیں ہے سیٹھ صاب ہمارا یقین کرو۔!"

"بس بس اب سیدھا اسٹور پر جاؤ۔!" فضل بھائی نے اسے بری طرح جھڑکا۔

"سلام والیکم سیٹھ صاب!" وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

فضل بھائی فاتحانہ انداز میں سکینہ کی طرف بڑھا۔ اسکی پیاسی آنکھیں ایک دم جیسے بجھ سی گئیں۔ ان میں اداسی جھلکنے لگی۔ اور وہ تھک کر مسہری پر گر پڑی۔

"ہوں۔۔۔۔ ہوں۔۔۔۔ ہوں" فضل بھائی پھنکارتا ہوا اس کے قریب آیا اور اس پر جھک پڑا۔ اس کے منہ سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ اس نے نفرت سے اپنا منہ پھیر لیا۔

"سکینہ! آج ہم تمہارے لئے ایک بہت کھوبصورت چیز لایا ہے۔!" اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک چمکدار خوشنما پیکٹ نکال کر اسے کھولتے ہوئے کہا۔

پیکٹ کے اندر واقعی ایک بہت خوبصورت اور نازک سی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔!!

"پورے نو سو روپے کا ہے!" اس کے ہونٹوں پر سانپ کا پھن لہرایا۔ "نگ اصلی ہیرے کا ہے" وہ خاموش رہی "صرف اس کا ہی قیمت پانچ سو سے جیادہ ہوں گا!" ہوں۔۔۔۔ ہوں۔۔۔۔ ہوں۔۔۔ پھن قریب آیا۔۔۔ "پسند آیا۔؟"

اس نے اپنا منہ پرے ہٹا لیا۔۔۔۔ لیکن سانپ نے ڈنک مار ہی دیا۔

پھر وہ پھنکاتا ہوا اٹھا اور رینگتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا!!!

سکینہ کو ابکائی سی آنے لگی۔ اس نے اپنے منہ میں اگلا ہوا زہر تھوک دیا جو نفرت اور حقارت کے شدید جذبوں کے ساتھ اس کے پورے جسم میں پھیلتا جا رہا تھا۔ اندر سے جیسے اس کا دل جلنے لگا۔۔۔۔۔

پیاس سے اس کے حلق میں کانٹے پڑ گئے۔۔۔۔

وہ بڑی بے تابی سے میز کی طرف لپکی جس پر گنے کے رس سے بھرے ہوئے دو گلاس رکھے تھے۔ اس نے ایک گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں اسکا سارا رس پی گئی۔۔۔۔ لیکن اسکی پیاس نہیں بجھی۔۔۔ اس نے دوسرا گلاس بھی منہ سے لگا لیا۔ لیکن وہ اب بھی پیاسی تھی۔۔۔ تھکے قدموں سے وہ مسہری پر آ کر گر پڑی۔

اندر سے جیسے اسکی پیاسی روح رو پڑی۔

اسے ایسا لگا جیسے فضل بھائی ایک انگوٹھی کے بدلے ان گلاسوں کی مٹھاس خرید چکا ہو۔!

آنسوؤں کی دھندلاہٹ میں اس نے دیکھا گنوں کی مٹھاس میں انگوٹھیوں کا رس گھلتا جا رہا ہو۔۔۔ اور اس زہر کا اندھیرا اسکی پوری زندگی پر چھاتا چلا جا رہا ہے اور وہ اس میں ڈوبتی چلی جا رہی ہے۔

ٹپ ٹپ۔۔۔۔ اس کی ہیرے جیسی چمکتی آنکھوں سے پلکوں پر آ کر ٹھہرے ہوئے آنسو لڑھکے اور پیکٹ میں جگمگاتی ہوئی انگوٹھی کے ہیرے پر گر پڑے ٭

افتخار اعظمی

نغمۂ وفا

"بھارت کے نظر بند ترقی پسند ساتھیوں کی نذر"

اے قلم تو کہ میرے ہاتھوں میں
میرے جمہور کی امانت ہے
تیرے ہی دم سے میرے سینے میں
شوق ہے جوش ہے حرارت ہے

تو نے بخشی ہے مجھ کو بے باکی
اے قلم جرأت آشنا ہے تو
تو نے کاٹی ہے راہ باطل کی
حق کی انصاف کی صدا ہے تو

تو نے توڑا ہے کذب کا جادو
مظہر صدق ہے صفا ہے تو
حوصلہ ہے جوان بیٹے کا
ماں کے ہونٹوں پہ اک دعا ہے تو

اے قلم اے مرے عزیز قلم
تو نہ ہوتا تو میرے سینے میں
درد عالم کی آگ بجھ جاتی
ولولے سرد پڑ گئے ہوتے!
جہد پیہم کی آگ بجھ جاتی

اے قلم اے مرے عزیز قلم
اس سے پہلے بھی لکھ چکا ہوں میں
گردشِ روزگار کی باتیں
تختۂ دار، حجرۂ زنداں
رقص جشن بہار کی باتیں

اس سے پہلے بھی لکھ چکا ہوں میں
آمدِ انقلاب کی باتیں —!
رات کی بے کراں سیاہی میں
جلوۂ آفتاب کی باتیں

اے قلم اے مرے عزیز قلم
بول کچھ بول آج کیا لکھوں
داستاں دار کی صداقت کی
نغمۂ جرأت وفا لکھوں

ہاں وہی نغمۂ جنوں انگیز
ہاں وہی نغمۂ نمود حیات
ہاں وہی نغمہ کہ جس سے روشن ہو
یہ سیہ بے کراں اندھیری رات

جس کے لکھنے کے جرم میں اکثر
اس سے پہلے بھی میں ہوا بدنام
ہو چکا ہے مرے جگر کے پار
اس سے پہلے بھی ناوکِ دشنام

لیکن اس کا مجھے نہیں ہے غم
تو جو شاہد مری وفا کا ہے
کیسے گونجی فضائے باطل میں
تو تو شاہد مری صدا کا ہے

اے قلم اے مرے عزیز قلم
بول کچھ بول آج کیا لکھوں
داستاں جذبۂ بغاوت کی
غم گیتی کا ماجرا لکھوں

یا چراغوں سے اپنے خون کے میں
بزم حق آشنا سجاؤں پھر
یا اگر تو مجھے اجازت دے
تو وہ تصویریں بناؤں پھر

جسکی دیکھی ہے اک جھلک میں نے
ہند ساگر کی بے کرانی میں
عہد نو کے حسین تصویریں
جذبۂ جہد کی جوانی میں

روم ساگر میں بحر فارس میں
یانگسی نیل اور گنگا میں
موج ڈینوب اور دجلہ میں
والگا، ٹیمز، اور جمنا میں

انقلابات کی کہانی میں
ارض محنت کی راجدھانی میں

ہاں وہ تصویر جس کا پرتو ہے
ارض بنگال پر کیرالا پر
کونے کونے پہ میرے گلشن کے
آندھرا، وادیٔ ہمالہ پر

ہاں وہ تصویر جس کے شیدائی
آج پھر قیدِ شہر یار میں ہیں
اے قلم زندگی کے دیوانے
آج پھر امتحانِ دار میں ہیں

اے قلم اے مرے عزیز قلم
غم نہ کر اس سے کچھ نہیں ہوتا!
کب سلاسل میں قید ہوتا ہے
زندگی کا عظیم ترسوتا —!!

پانچ سو، پانچ لاکھ، پانچ ہزار
قید کتنے کریں گے اہلِ ستم
کب رکیں گے جفا شعاروں سے
بڑھ چلے ہیں رہ وفا پہ قدم

اے قلم اے مرے عزیز قلم
بول لکھ دوں کہ وقت آپہونچا
جذبۂ دل کے آزمانے کا
ہے یہی نکتۂ عروج وفا
گلشنِ ہند کے فسانے کا

جس کے آنکھیں ہوں دیکھ لے آکر
رنگ ہی اور ہے زمانے کا
تھام سکتا نہیں کوئی دامن
پرچم سرخ کے دیوانے کا

اے قلم اے مرے عزیز قلم
بول لکھ دوں کہ دشت و دریا سے
عزم جمہور کی صدا آئی
کھنکھناتے ہیں شیشہ و ساغر
جانب شرق سے گھٹا آئی

ٹریڈ یونین اور سوشلزم

مصنف :- جم گارڈنر
مترجم :- اظہر عباس

"انگلستان کے ایک مشہور ٹریڈ یونین رہنما نے اپنی کتاب "ٹریڈ یونینوں کے لئے بنیادی سوالات" میں انگلستان کی موجودہ ٹریڈ یونین تحریک کا تفصیلی جائزہ لیا اور کتاب ھذٰا کے ایک باب میں انگلستان میں ٹریڈ یونین ازم اور سوشلزم کے اہم موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے محنت کش طبقے کے متعلق بہت سے مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے۔ اسی باب کا ترجمہ، تھذیب وتلخیص کے بعد قارئین منشور کی خدمت میں پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں ———!"

ا — ع

ایک مشہور ماہر معاشیات نے ۱۸۴۴ء میں انگلستان کے محنت کش طبقے کے ہوشربا حالات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا تھا کہ :-

"یہ صحیح ہے کہ برسر اقتدار طبقہ کی طاقت کو ختم کرنے کے لئے ٹریڈ یونینوں اور ہڑتالوں سے بڑھ کر کسی اور "زبردست شے" کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن ٹریڈ یونینوں اور انکے ذریعے کی گئی ہڑتالوں کی خاص الخاص اہمیت یہ ہے کہ وہ محنت کش طبقہ میں باہمی مقابلہ ختم کرنے کی سمت پہلا قدم ہیں ——— ٹریڈ یونین اور ہڑتالیں اس امر کی دلالت کرتی ہیں کہ سرمایہ داروں کی برتری کا دارو مدار صرف محنت کشوں کے باہمی مقابلے پر ہے۔ اپنی احتیاج پوری کرنے کے لئے کام سے چمٹے رہنے کی مجبوری اور ضرورت پر ہے کیونکہ یونین خواہ ان کا دائرہ تنگ ہی کیوں نہ ہو، یا وہ یکطرفہ ہی

اسلحہ سازی پر کثیر زر ضائع کر دیا جاتا ہے یہ اسلحہ جات نہ تو کسی کا پیٹ بھر سکتے ہیں نہ کسی کو کپڑا مہیا کر سکتے ہیں نہ کسی کو مکان فراہم کر سکتے ہیں نہ کسی فرد کو مسرت بخش سکتے ہیں اور نہ روشنی کی کرن دے سکتے ہیں۔ یہ تو بس اپنے ہمراہ موت اور تباہی کا پیغام ہی لا سکتے ہیں ———!

انگلستان میں ٹوری جماعت کے آٹھ سالہ دور اقتدار میں سرمنٹ کے اندر اسلحہ جات پر تین ہزار پونڈ، فی گھنٹہ ایک لاکھ اسی ہزار پونڈ، یومیہ ساڑھے بیالیس لاکھ پونڈ ہر ہفتہ تین کروڑ پونڈ خرچ کئے گئے اور لاکھوں روپیہ منافع کی شکل میں اسلحہ ساز فیکٹریوں کے حصہ داروں کی جیب میں گیا جبکہ، اسی روپے سے ۶۰ لاکھ مکانات ہار ہزار نئے اسکول دو سو نئے ہسپتال تعمیر کئے جا سکتے تھے۔ در ملک میں عمر سیدہ پنشن کے مستحق

کیوں نہ ہوں، وہ موجودہ سماجی ڈھانچے کی بنیاد سے سرپیکار رہتی ہیں لہٰذا وہ موجودہ سماجی نظام پر بلاشبہ کسی نہ کسی حد تک کامیاب، زبردست موثر، اور کاری وار کرنے سے کبھی نہیں چوکتیں ———!"

وہ "زبردست شے" کی بھی ضرورت ہے اور وہ ہے تنظیم اور پالیسی کا اتحاد اور وہ جیالی قیادت جو اس لڑائی میں شدت پیدا کر سکتی ہے۔

جدید سائنس اور تکنیک نے اس بات کو کلی طور پر ممکن بنا دیا ہے کہ محنت کرنے والے تمام مردوں، عورتوں اور ان کے خاندانوں کے لئے ــ کام تفریح اور اعلیٰ زندگی، اور جہاں وہ رہتے ہیں اس دنیا کا علم نیز ایجادات سے بہتر طور پر مستفید ہونے کی صلاحیت پیدا کی جا سکے۔ اگر محنت کش طبقہ، ایک بار سرمایہ کی گرفت سے آزاد ہو جائے تو یہ سب کچھ مختصر سے عرصہ میں عملی سیاست بن جائے گا۔

لازمی طور پر سوشلزم میں جوہری توانائی، خودکاری، سائنسی اور جدید صنعتی تکنیک کے ذریعہ پیداوار بڑھائی جائے گی۔ اجارہ دار سرمایہ داری کے ہاتھوں میں ان تمام ذرائع کے ہونے کا واحد مقصد یہ ہے کہ چند افراد کے لئے کثیر منافع اور اکثریت کے لئے بے روزگاری کے خطرات کے ساتھ ساتھ اکثریت کے لئے استحصال میں اضافہ کرنے والے حالات بھی برداشت کر لئے جائیں۔

سرمایہ دارانہ نظام میں دکانیں مختلف اشیا سے بھری رہتی ہیں لیکن کیونکہ اشیا کے خالق اپنی محنت کے ثمر کو خرید کر استعمال کرنے کے لائق نہیں ہوتے اسی لئے اس نظام میں پیداوار محدود کر دی جاتی ہے جس کے نتیجے میں مشینیں اور، کام گار جو کثیر مقدار میں اشیا پیدا کر سکتے ہیں بیکار ہو جاتے ہیں۔

تاریخ کے تہذیب یافتہ دور میں جہاں یہ سب کچھ ہوتا ہے وہاں افراد کو ہفتے میں فی کس ایک پونڈ زائد ادا کیا جا سکتا تھا۔

لیکن یہ سب کچھ نہیں کیا گیا۔ جو کچھ ہوا اس کے برعکس اور برخلاف ہوا۔ لوگوں کو مکان سے بے دخل کیا گیا۔ کرایوں میں اضافہ ہوا۔ مکانوں کی قلت ہوئی، اسکولوں میں جگہ نہیں رہی۔ چودہ سال کے دوران صرف ایک ہسپتال تعمیر ہوا۔ ضعیفوں کو قلیل پنشن پر ریٹائر کیا گیا۔

ان تمام حقائق کے پیش نظر، آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمیں اپنے پرچموں پر سوشلزم لکھ لینا چاہیئے۔ کیونکہ اس نظام میں یہ تمام برائیاں بیخ وبن سے، اکھاڑی جا سکتی ہیں۔

یوں اگر دیکھا جائے تو ٹریڈ یونینوں کو کئی سال پیشتر اس شدید ضرورت کا احساس ہو چکا تھا۔ "ایک ایسی حکومت جو انسانیت کے استحصال کا خاتمہ کر دے" آج سب سے بڑا تقاضہ ہے۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ ٹریڈ یونینوں اور کامگاروں کے مسائل خواہ وہ کتنے ہی پیچیدہ کیوں نہ ہوں سوشلزم کی راہ اختیار کر کے یقینی طور پر حل کئے جا سکتے ہیں۔

اس صداقت کا اعتراف مختلف ٹریڈ یونینوں نے اپنے دستور اور اپنے قانون کی کتابوں میں جگہ جگہ کیا ہے۔

اے ای یو کے منشور میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ :-

"سرمایہ داری ختم کر کے اشتراکی سماج کے قیام کے سلسلے میں ٹرانسپورٹ اور جنرل ورکرز یونین اپنے ساڑھے بارہ لاکھ ممبران کو ہدایت دیتی ہے کہ اپنے قبضہ، قدرت میں موجود ہر قوت کو استعمال کرتے ہوئے اس امر کی کوشش کرنا چاہیئے کہ جس صنعت میں بھی وہ کام کر رہے ہیں اس کا انتظام وہ خود سنبھالیں"

الیکٹریکل ٹریڈ یونین جن مقاصد کے لئے کام کرتی ہے۔ ان میں یہ مقصد بھی شامل ہے کہ :-

"ایسی پالیسیاں وضع کی جائیں جنکی رو سے محنت کش صنعت اور صنعتی انتظام کے مختار بن جائیں!" اے یو ایف ڈبلیو کے دستور کے پیش لفظ میں درج ہے کہ ہمارا یہ نصب العین ہے کہ "محنت کشوں کے مفاد میں کام کرنے اور ان کا معیار زندگی بلند کرنے کے لئے امداد باہمی کے نظام کو اس حد تک وسعت اور فروغ دیں جب تک کہ امداد باہمی کی ایک ایسی دولت مشترکہ نہ بن جائے جسکی محنت اور پیداوار تمام افراد کے لئے ہوگی۔"

آج محنت کشوں کی تحریک میں بنیادی ضرورت اس امر کی ہے کہ انکا اتحاد اور یگانگت کافی مضبوط ہو تاکہ ان جلیل القدر مقاصد کو پورا کیا جا سکے — لیکن سوشلزم کی خواہش کرنا اور اسے حاصل کرنا دو مختلف چیزیں ہیں۔

آجر، وڈیرے اور زبکار اپنا منافع، معاشی مراعات اور سماجی حالات برقرار رکھنے کے لئے ہر طریقہ استعمال کریں گے اور وہ ہر طرح "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں گے تاکہ اشتراکیت کے قیام کی تحریک آگے بڑھنے سے روکی جا سکے۔

رجعت پرست اور مفاد پرست ٹریڈ یونین رہنما ان لوگوں کے دباؤ میں آجاتے ہیں اور وہ یا تو اشتراکی مقصد کو ہی خیرباد کہہ دیتے ہیں یا پھر سوشلزم کو اس طرح مسخ کرکے پیش کرتے ہیں جو حقیقتاً اس نظریہ کو خیرباد کہنے کے مترادف ہے ان کے نزدیک "قومی ملکیت" ایک گندہ تصور ہے۔ یہ تو "ترقی" کا نیا تصور "بڑی تجارت میں حصہ داری" کے نعرے کی شکل میں پیش کرتے ہیں جو دراصل سرمایہ داروں کے جنگل میں حصہ مانگنے کے برابر ہے۔ انتہا تو یہ ہے کہ سوشلزم کو دقیانوسی اور فرسودہ نظریہ قرار دیا جا رہا ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ حکمرانوں اور لیڈروں کی طرف سے ان نام نہاد نظریات کے خالقوں کو نوابوں کے خطابات — یا ایوان بالائی نشستوں پر جگہ دے کر اور بہترین حلقوں میں داخل کرکے نوازا اور رام کیا جاتا ہے۔

لیکن یہ تمام حرکتیں ناکام ہو کر رہیں گی۔ سرمایہ داری مسلسل بحران کا شکار رہتی ہے، جیسے وہ بے روزگاری پیدا کرکے، حقیقی تنخواہ گھٹا کر، سماجی بہبود کے اداروں میں پیسہ نہ لگا کر مستقبل میں منافع بٹورنے کی خاطر قسطوں میں مال فروخت کرکے اور نو آبادیوں اور نو آبادیاتی معیشت رکھنے والے دیگر ممالک میں سستے داموں ملنے والی محنت کا استحصال کرکے دور کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ دوسروں کی محنت پر زندہ رہنے والے چند رئیس عیش و آسائش کی زندگی بسر کرتے ہیں جبکہ بیمہ شدہ افراد کی تعداد میں سے ایک تہائی تعداد نو پونڈ فی ہفتہ میں گزر بسر کرنے پر مجبور کردی جاتی ہے اور پچاس لاکھ لازمی طور پر ضعیف العمری کے باعث ریٹائر ہونے والے افراد پنشن کی حقیر رقم پر زندہ رہنے کے موذی مرض کا شکار ہیں اور ان میں سے بھی تقریباً نصف امدادی رقم کے حصول کے لئے مارے مارے پھرتے ہیں۔ انگلینڈ کی ٹوری جماعت کی یہ ہی وہ کارکردگیاں ہیں۔ نام نہاد لیبر پارٹی اپنی رجعت پسندی اور موقع پرستی کی وجہ سے للکارنے سے قاصر رہتی ہے بلکہ خود اپنے دور اقتدار میں ٹوری جماعت کی عوام دشمن پالیسیوں کو اپنانے میں خود ٹوری جماعت سے بھی آگے نکل جاتی ہے۔

لیکن اس وقت ایک اشتراکی للکار موجود ہے جسکا فوجی چیلنج سے قطعی کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ یہ للکار تو اشتراکی ممالک سے تجربات زندگی سے پیدا ہوتی ہے یہ ایک نظریاتی چیلنج ہے جسکا تعلق ایک ایسے سماج کی تشکیل ہے جہاں ذرائع پیداوار کی ملکیت، تقسیم اور مبادلہ اجتماعی ہوتا ہے۔ صنعتیں جو وقت مزدوروں کی ملکیت اور ان کے زیر انتظام ہوں تو وہ مکمل روزگار فراہم کر سکتی ہیں۔ اجتماعی ملکیت کا نظریہ اس کائنات اور محنت کش طبقے کے حالات زندگی کو بہتر بنانے، سائنس اور تکنیک میں حیرت انگیز ترقی اور عوام کی سماجی، تعلیمی اور ثقافتی زندگی کو سنوارنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔

اشتراکی ممالک میں منافع کے لئے بولی لگانا غیر قانونی ہے۔ وہاں اسٹاک ایکسچینج میں سٹہ بازی نہیں ہوتی۔ وہاں کوئی وڈیرہ نہیں جو زائد لگان وصول کرے۔ کوئی مالیاتی کارپوریشن نہیں جو قرضوں وغیرہ پر بے تحاشہ سود وصول کرتی ہو۔ صنعت کسی کی ذاتی ملکیت نہیں جہاں اشیاء کو منافع حاصل کرنے کیلئے پیدا کیا جاتا ہے۔

اشتراکی ممالک میں کام گار اپنی ٹریڈ یونینوں کے ذریعے پیداوار اور اقتصادی منصوبہ بندی میں حصہ لیتے ہیں اور کام کی اجرت کا تعین کرتے ہیں۔ وہ صنعتوں کے واسطے جہاں وہ کام کرتے ہیں اور جو انکی اجتماعی ملکیت ہے منصوبے بناتے ہیں۔ ان پر بحث و مباحثہ کرتے ہیں ترمیم کرتے ہیں اور انکی منظوری دیتے ہیں ان کا پاس کردہ منصوبہ متعلقہ صنعت میں جس کا وہ خود ایک جزو ہوتے ہیں اپنا لیا جاتا ہے اور بالآخر وہ پورے ملک کے ہمہ گیر منصوبے کا حصہ بن جاتا ہے۔ الیکٹرونکس خودکاری، اور جدید تکنیک کے استعمال کے باعث ان کا یہ منصوبہ پیداوار میں مستقل اضافے کا موجب ہوتا ہے۔ اس کا مقصد محنت کشوں کے لئے کام زیادہ سہل اور محفوظ بنانا۔ زیادہ تنخواہوں کے ساتھ مکمل روزگار مہیا کرنا۔ اوقات کار گھٹانا اور زیادہ چھٹیاں دینا ہے۔ یہ جدید تکنیک میں مہارت حاصل کرنے کی سہولتیں فراہم کرتا ہے اور گہوارے سے لے کر لحد تک ایک خوشگوار اور محفوظ زندگی کی ضمانت دیتا ہے

اشتراکی ممالک کی ٹریڈ یونینوں کا ان مقاصد کے حصول سے گہرا تعلق ہے وہ محفوظ اور صحت مند حالات کار پیدا کرنے میں پہل کرتی ہیں۔ ان طریقوں پر عمل درآمد کراتی ہیں۔ صنعتی معاملات میں خود تحقیق کرتی ہیں، صنعتی صحت اور تحفظ پر اپنے ماہرین رکھتی ہیں۔ حفظان صحت، روشنی اور روشندانوں کی خود دیکھ بھال رکھتی ہیں۔ حفاظتی تدابیر کا معائنہ کرتی ہیں اور یہ فیصلہ کرنے کی مجاز ہوتی ہیں کہ، آیا منتظمین صحت اور حفاظتی انتظامات کی جسکے سبب کسی کامگار کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو خلاف ورزی تو نہیں کر رہے۔ وہ سماجی بہبود اور شعبۂ صحت کے انتظام میں حصہ لیتی ہیں۔ وہ ان افراد کو جو بیماری یا چوٹ لگنے کی باعث کام کرنے کے لائق نہ رہے ہوں پوری تنخواہیں دینے میں کلیتاً آزاد ہیں۔ ان تمام کاموں کے لئے روپیہ فیکٹری یا دوسرے ادارے کے فنڈ سے جہاں متعلقہ فرد کام کرتا ہو فراہم کیا جاتا ہے۔

ثقافتی شعبہ میں عام اور تکنیکی تعلیم میں اور ہر قسم کے کھیل میں ٹریڈ یونینیں سہولتیں بہم پہنچاتی ہیں اور تفریح اور آرام کے مواقع فراہم کرتی ہیں۔ وہ منتظمین سے کئے گئے صنعتی معاہدوں پر عمل درآمد کرانے پر قادر ہوتی ہیں اور منتظمین کسی کامگار کو ٹریڈ یونین کی منظوری حاصل کئے بغیر ملازمت سے برطرف نہیں کر سکتے۔ ایک اشتراکی ملک میں ۲۳ ٹریڈ یونینیں ہیں جنکے ممبران کی تعداد پانچ کروڑ ہے۔ ان یونینوں کے ذریعے محنت کشوں کا اختیار حقیقت کے سانچے میں ڈھل چکا ہے یہاں ایک تخصیص کی جا سکتی ہے کہ اگر برطانوی کامگار اسوقت اشتراکی منصوبہ بندی پر عمل کرنا شروع کریں تو وہ بہت تیز رفتاری سے ترقی کریں گے اور غالباً کام اور زندگی کے حالات بہتر بنانے کی دوڑ میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک سے آگے نکل جائیں گے۔ بدقسمتی سے مستقبل میں برطانیہ میں اشتراکی منصوبہ بندی شروع ہونے کے آثار نہیں پائے جاتے۔ حالانکہ اس بات کی توقع ہے کہ برطانوی کامگار موجودہ حالات و مسائل کا احساس کریں گے اور فیصلہ کریں گے کہ ان کو برطانیہ کے حالات کے مطابق ایک حقیقی اور لافانی آسائش کے حصول کی خاطر جو دوسرے اشتراکی ممالک سے بہتر ہو اشتراکی راستہ اختیار کرنا چاہیے

برطانیہ میں فی زمانہ سرمایہ داری ہر قسم کے مسائل سے دوچار ہے۔ اس کے امریکہ، مغربی جرمنی اور جاپان کے طبقاتی "برادران" اسکی منڈیوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ شہنشاہیت کا آفتاب غروب ہو رہا ہے۔ کیونکہ نو آبادیاتی عوام آزادی حاصل کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ مقامی محنت کش طبقہ ان ایام کی واپسی کا مخالف ہے جہاں سے اس نے ابتدا کی تھی۔ وہ خیراتی ٹکڑوں پر پلنے سے انکار کر رہی ہے۔ یہ امر برطانوی ٹریڈ یونینز کے لئے شاندار مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے۔

ٹریڈ یونینوں کے لئے یہ وقت بہت مناسب ہے کہ وہ اپنے پارلیمانی نمائندوں پر واضح کر دیں کہ ان کا یہ کام ہرگز نہیں کہ ٹوریوں کی بولی بولنے لگیں۔ اس کے تباہ کن نتائج ہوں گے۔ ان پارلیمانی نمائندوں کو طبقاتی جدوجہد خیرباد کہنے کے لئے نامزد نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اس جدوجہد کو اسی جوش وخروش سے چلانا چاہیئے جیسا کہ ہماری تحریک کے بانیوں میں پایا جاتا تھا اور جس کا مظاہرہ یونین کے اراکین روزمرہ، فیکٹریوں، کانوں اور رسل ورسائل کے اداروں میں کر رہے ہیں۔ ان کو اس مقصد کے لئے بھی نامزد نہیں کیا گیا کہ وہ سرکاری یا مختلف کمیٹیوں کی زینت بنیں یا سرمایہ دارانہ نظام کے ہونہار منتظم کی حیثیت سے اپنا پارلیمانی مستقبل بنائیں۔ ان کو سرمایہ داری ختم کرنے کی جدوجہد ختم کرنے کے لئے نامزد کیا جاتا ہے۔ محنت کشوں کا جو ان کو الیکشن کے اخراجات دیتے ہیں استحصال ختم کرانے اور اس بات کا امکان پیدا کرنے کے لئے نامزد کیا جاتا ہے کہ وہ پارلیمانی تنخواہ وصول کر سکیں ان کی تنخواہوں کے لئے جھگڑا نا پڑتا تھا تاکہ جس وقت وہ پارلیمان کے رکن بن کر نئے سماج کے قیام کی جدوجہد میں مصروف ہوں ذاتی الجھنوں سے چھٹکارا پا سکیں۔ کئی یونینیں اور ان کے نمائندے جو پارلیمان کے رکن بن گئے ہیں اشتراکی ملکیت کے اصول سے وفاداری کر رہے ہیں۔

زریں اصول پر اٹل یقین کو اپنے عمل سے ظاہر کرنا ضروری ہے۔ لیکن ایسے حالات سے بہت مختلف طریقے پر جن سے کامگاروں کو موجودہ قومی صنعتوں میں سابقہ پڑ رہا ہے۔ ان صنعتوں کے قومی ملکیت میں ہونے کے باوجود کان کنوں کے علاوہ دیگر کامگاروں کو تنخواہ میں اضافے یا حالات کار کی بہتری کی صورت میں کوئی مادی فوائد حاصل نہیں ہوئے اور کان کنوں کو بھی جو مراعات حاصل ہیں انکے ختم کئے جانے کا اندیشہ ہے۔

ہمہ گیر اشتراکی منصوبہ بندی کے لئے لوہا، فولاد وہ دیگر انجنیئرنگ صنعتوں کا سماجی ملکیت میں ہونا ناگزیر ہے۔ ان کے ذریعہ ہر شے کو اشتراکی بنیادوں پر منظم کرنے کا ایک نیا مقصد نکالا جا سکتا ہے۔ اندرون ملک ٹرانسپورٹ کی منصوبہ بندی اس بات کی متقاضی ہے کہ ریل سڑک اور آبی راستے مربوط طور پر منظم کئے جائیں۔ تمام خدمات اشتراکی ملکیت میں ہوں، اور ان کے ساتھ ہی ساتھ تمام متعلقہ پیداوار اور ان چیزوں کو بنانے والے ادارے بھی، ایسے نظام کا تعلق بیرونی جہاز رانی، بندرگاہیں، ہوائی کمپنیاں، جہاز سازی، جہازوں کی مرمت سازی اور طیارہ ساز اداروں سے پیدا کرنا چاہیئے جو اجتماعی ملکیت میں ہوں۔ عمارات اور عمارتی سامان کی سپلائیز کو سماجی ملکیت میں لینے سے مکانات، اسکول، ہسپتال اور دیگر تعمیرات کی منصوبہ بند ترقی کی گنجائش پیدا ہوگی۔ یہ چند ایسی مثالیں ہیں جن سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اشتراکی منصوبہ بندی کا مقصد کیا ہے۔ اشتراکی منصوبہ بندی اسی وقت ممکن ہے جبکہ صنعت سماجی ملکیت میں ہو اور اس سے سماجی مقصد حاصل کیا جائے۔

قومیانے کی پالیسی کے خلاف سرمایہ داروں کا پروپیگنڈہ ذاتی ملکیت کا جواز پیدا کرنے کی خاطر حقائق کو دانستہ طور پر توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے پروپیگنڈے میں اس امر کا ذکر نہیں کیا جاتا کہ کانیں اور ریلیں پہلے سرمایہ داروں کے قبضہ میں تھیں اور یہ کہ کانوں کے پرانے مکان اور ریلوں کے حصہ دار مقرر کردہ زائد قیمت خرید پر ایک خطیر رقم بطور سود وصول کر رہے ہیں اور ان کو ہر حال میں ایک بڑھتی ہوئی مقررہ رقم بطور منافع دی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اتنا منافع ذاتی ملکیت کے دور میں بھی ادا نہیں کیا گیا۔ اس پروپیگنڈے میں یہ ذکر بھی نہیں ہوتا کہ صنعتوں کو فراہم کیا جانے والا کوئلہ اور اسکی ترسیل کے خرچ کی شرح ذاتی صنعتوں کو مراعات دیتے ہوئے عالمی منڈی میں کوئلے کی قیمت سے ایک پونڈ فی ٹن مقرر کی گئی ہے۔ جبکہ نجی صنعتوں کی پیداوار کی قیمت پر کوئی کنٹرول نافذ نہیں کیا گیا۔

قومی صنعت کے لئے بنیادی ساز و سامان نجی صنعتوں سے لیا جاتا ہے۔ اس سامان کی فراہمی کے لئے نقصان دہ اور بلا مقابلہ ٹنڈر رکھنے کے الزامات برابر عائد کئے گئے ہیں جنکی کبھی تردید نہیں کی گئی۔ قومی صنعت کو سابقہ مالکوں اور حصہ داروں کے منافع کے لئے چلایا گیا ہے۔ نجی صنعت کے عروج اور صنعت کاروں کو مہنگے نرخ پر اشیا فراہم کرنے کے آرڈر دینے کی خاطر، مختصر یہ کہ نجی صنعت کو تمام مراعات حاصل ہیں اور عوام کو منجملہ وہ محنت کش جو قومی صنعتوں میں ملازم ہیں کوئی سہولت میسر نہیں۔ عوام کو فائدہ پہنچانے کی بجائے یہ نجی صنعتیں منافع کمانے کا ایک ذریعہ فراہم کرنے کے لئے چلائی جاتی ہیں۔ اگر صنعتوں کو اشتراکی منصوبہ بندی کے لئے بنیاد فراہم کرنا ہے۔ اور اگر ٹریڈ یونینوں کو اس میں موثر کردار ادا کرنا ہے تو قومیانے کی پالیسی پر مزید اور فوری عمل کی ضرورت ہے۔

گنتی کے ان چند ٹریڈ یونین رہنماؤں کی نگاہوں پر جو قومی صنعت کے انتظامی بورڈوں میں شامل ہیں پردہ پڑا ہوا ہے اور وہ جو کچھ ہو رہا ہے دیکھنے سے قاصر ہیں۔ بورڈ کے ان ممبران کی جگہ سنبھالنے کے لئے جو مختلف نجی صنعتوں کے ڈائکٹر بھی ہیں اور ان صنعتوں کی نمائندگی کرتے ہیں مزید ٹریڈ یونین رہنماؤں کی ضرورت ہے لیکن ان کا چناؤ اس بنیاد پر ہونا چاہیئے کہ انکو اجتماعی ملکیت اور محنت کش طبقے میں اعتقاد ہے اور یہ ایماندار و عوام دوست ہیں۔

حقیقی کامیابی کے حصول کے لئے عوام کو لازمی طور پر خود اس بات کا علم ہونا چاہیئے کہ قومیانے کا کیا مقصد ہے۔ صنعتوں کو قومیانے کا مقصد ایک ایسا دلیرانہ پروگرام ہے جو اس پروگرام سے بہت مختلف ہوگا جیسا کہ نام نہاد لیبر حکومت لیبر پارٹی کا رہا ہے۔ تکنیکی طور پر پسماندہ، غیر منافع بخش اور نیم دیوالیہ صنعتوں کو قومیانا اور منافع بخش صنعتوں کو ذاتی ملکیت میں رہنے دینا اشتراکی نظریہ کے منافی ہے۔ یہ سرمایہ داری کو سرمایہ داروں کے لئے بقا دینے کا دائیں بازو کا نظریہ ہے کوئی کامگار ایسی قومی صنعت کے لئے جہاں سود کی ادائیگی کے سبب نجی صنعتوں سے کم اجرت ملتی ہو۔ کسی جوش وخروش کا اظہار نہیں کر سکتا سود کی ادائیگی کو جائز طور پر قومی قرضے کی مد میں دیدینا چاہیئے۔ بہرحال قومی صنعتوں کی فی الحال یہ کیفیت ہے۔ قومیانے کی پالیسی کو اشتراکی مقصد میں استعمال کرنے کے لئے لازمی ہے کہ ایسی خوشحال صنعتوں کو جو حصہ داروں کو منافع کے لئے پوری قوم کا استحصال کر رہی ہیں سب سے پہلے قومی ملکیت میں لیا جائے۔

قومیانے کا مطلب یہ ہونا چاہیئے کہ قومی صنعت میں کامگار کو ایک بہتر مقام ملے۔ ایسی صنعتوں کو اونچی تنخواہ اور بہتر حالات فراہم کرنے چاہئیں۔ ان کو روزگار اور سماجی تحفظات کی ضمانت دینی چاہیئے۔ سب سے زیادہ یہ کہ ان کو ایسا مواد مہیا کرنا چاہیئے جسکی بنیاد پر ہمہ گیر منصوبہ بندی ہو سکے۔ یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب ایسی تمام صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا جائے۔ جنکے اشتراکی ملکیت میں آنے کے بعد پوری معیشت کی منصوبہ بندی کی جا سکے۔ یہ ہیں وہ مقاصد جنکا حصول

باقی صفحہ ۳۸ پر

مسلم شمیم

بلا عنوان

یہ اونچ نیچ یہ نفرت یہ جہل یہ افلاس!
زمیں پہ کس نے لگائے یہ جہل کے پودے
کہ جن کے سائے میں انسانیت سسکتی ہے
کہ جن کی چھاؤں میں ہوتے ہیں موت کے سودے

فریب و کذب کے سر پہ ہے تاج زر افشاں!
صداقتوں کی جبیں پر لہو کا ٹیکا ہے
پنہا کے ظلم کو کس نے لبادہ تقدیس
گلوں کے نام پہ صدیوں چمن کو لوٹا ہے

ثنائے جبر و ستم ہے ادب کا شہپارہ ـــ!
خلوص فکر و نظر عیب ہے فسانے میں ـــ!
حقیقتوں کا بیاں ہے بغاوتِ احساس!
اصول سب سے بڑا جرم ہے زمانے میں!

شکستِ دل کو سمجھتے ہیں عشق کی عظمت
ان آنسوؤں سے چراغوں کا کام لیتے ہیں
دکھوں کے شہر میں بے جان سی ہنسی کیلئے
ہم اپنے ذہن کو پہروں فریب دیتے ہیں

بھٹکتے رہتے ہیں احساس کے بیاباں میں
ضمیر فن کو سیہ ناگ ڈستے رہتے ہیں
نظر سے اہل زمانہ کی ہو کے پوشیدہ
ہم اپنی فکر کے شعلوں میں آپ جلتے ہیں

یہ سوچتے ہیں رہیں بے نیازِ سود و زیاں
بجھا دیں ذہن کی شمعیں، بجھا دیں دل کے دیئے
مگر وفا کے تقاضے ہیں کس قدر بیبا کے
رواں دواں ہیں چراغِ خلوصِ درد لئے

قدم قدم پہ رہِ عشق میں ہیں تعزیریں!
مگر یقین ہے لوٹیں گی غم کی زنجیریں!

شبی فاروقی

غزل

کیونکر نہ ہو گلچیں پہ گراں ذوق نمو بھی
کھل جائیں گے کچھ پھول تو مہکے گا لہو بھی

یخ بستگئ ذہن سے مایوس نہ ہونا!
کافی ہے رہِ شوق میں احساس کی لو بھی

اس بزم خرابات کی ہر رسم نئی ہے
گردش میں ہے ساغر بھی یہاں ظرف وضو بھی

اپنوں ہی پہ موقوف نہیں راہ وفا میں
ہمراہ چلے آتے ہیں کچھ دور ـــ عدو بھی

اظہار حقیقت ہے اگر جرم تو چپ ہیں
جب زخم نہ مہکیں گے تو کرلیں گے رفو بھی

ہم کو بھی محبت ہے شبی ارض وطن سے
اس خاک میں شامل ہے شہیدوں کا لہو بھی

برقع پوش

سعیدہ افضل

گاڑی ہچکولے کھاتی چھکا چھک چلی جا رہی تھی۔

وہ سیٹ پر سر ٹکائے آنکھیں موندے یوں بیٹھی تھی جیسے یہ ہچکولے نیند کی شفیق تھپکیاں ہوں۔ جو اسے سلانے پر تلی ہوں۔ اس طرح آنکھیں بند کئے اسے ایک عجیب سا سرور محسوس ہو رہا تھا۔

سامنے کی کھڑکی کھلی تھی۔ اور ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے اس کا چہرہ سرد کئے دے رہے تھے۔ ڈبہ تقریباً خالی تھا۔ حالانکہ انٹر کلاس کے ڈبوں میں ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ اس کے برابر والی سیٹ پر ایک سفید برقع پوش عورت بالکل مستعد بیٹھی تھی۔ ایک بچہ اس کے پہلو میں دبکا ہوا تھا۔ دوسرا گود میں شاید اسے بھی اگلے اسٹیشن پر اتر جانا تھا۔

گاڑی کی رفتار آہستہ ہوتی جا رہی تھی۔ اور کھڑکی سے اندھیرے میں دور ٹمٹاتی شہر کی بتیوں کو بآسانی دیکھا جا سکتا تھا۔

"پتہ نہیں کون سا اسٹیشن ہے؟" اس نے بے دلی سے سوچا۔

ساری کا پلو سر کے گرد لپیٹ کر وہ ذرا سنبھل کر بیٹھ گئی۔

سفید برقع پوش عورت اپنے بچوں سمیت اتر گئی تھی۔ اور قلی نیا سامان سامنے والی اوپر کی برتھ پر جما رہا تھا۔ ایک بستر تھا۔ ایک ہلکا سا سوٹ کیس۔ گاڑی چلی تو اس نے نئی آنے والی خاتون کا بغور جائزہ لیا۔

سیاہ چمکتے ہوئے برقع میں ملبوس۔ آنکھیں نیلی نیلی۔ گہری جھیل ایسی۔ مگر ایک عجیب سا اضطراب لئے۔ گہرا میک اپ تھا۔ کانوں میں آویزے۔ خاصی حسین لگ رہی تھی۔ پلکیں جلد جلد جھپکاتے ہوئے تو وہ اور بھی اچھی لگ رہی تھی۔ جتنی دیر گاڑی اسٹیشن پر رکی رہی۔ وہ کھڑکی میں منہ ڈال کر باہر کی طرف دیکھتی رہی۔ گاڑی چلی تو وہ بھی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

ایک چیز جو اسکے چہرے پر سب سے نمایاں تھی۔ اس کے انتہائی سرخ سرخ ہونٹ تھے۔

اگر اس نے ذرا کم گہرے رنگ کی لپ اسٹک لگائی ہوتی تو کتنی اچھی لگتی شاہدہ نے یونہی سوچا۔

شاہدہ کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے وہ ذرا سنبھلی اور پھر مسکرا دی۔ شاہدہ اس اچانک بے تکلف مسکراہٹ سے گھبرا سی گئی اور پھر وہ جواباً مسکرانے لگی۔ گاڑی اب اپنی پوری رفتار سے چل رہی تھی۔ اس پر پھر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ پہلے کی طرح سیٹ سے سر ٹکا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور ذرا دیر میں تو وہ اپنی نئی ہمسفر کو بالکل بھول چکی تھی۔

دس پندرہ منٹ یونہی آنکھیں بند رکھنے کے بعد بڑی کاہلی سے اس نے ذرا سی آنکھیں کھولیں۔ نو وارد خاتون بڑے ہی غور اور دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھیں ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ لئے ایک عجیب و غریب اشتیاق کے ساتھ۔ جیسے شوخ و شریر بچے بڑے ہی اشتیاق کے ساتھ سجی سجائی نئی دلہنوں کو دیکھتے ہیں۔

گھبرا کر شاہدہ نے اپنی پوری آنکھیں کھول دیں۔ اسے ایک عجیب طرح کا احساس ہوا۔ ایسا کہ اس سے پہلے کبھی اسے کسی ہم جنس سے نہ ہوا تھا۔ وہ کچھ شرمندہ شرمندہ سی سنبھل کر بیٹھ گئی۔ جیسے اس کے سامنے کوئی اجنبی نوجوان آبیٹھا ہو۔

خاتون کچھ ایسی معنی خیز سی ہنسی ہنسیں۔ جیسے انھیں اس گھبراہٹ نے بہت ہی محظوظ کیا ہو۔ جواباً اسے بھی مسکرانا پڑا۔ گو وہ اس ہنسی کا مطلب قطعی نہ سمجھی تھی۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں" بے قرار نگاہوں نے پہل کی۔

"جی... میں... میں... اپنے گھر۔ اپنی والدہ کے پاس، اور آپ۔۔؟"

"میں بھی گھر ہی جا رہی ہوں۔۔ کراچی۔"

"اوہ تب تو ساتھ رہے گا" وہ ذرا یونہی اخلاقاً بولی۔

"آپ کہاں سے آ رہی ہیں؟" خاتون نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"حیدر آباد سے۔۔ خالہ کا انتقال ہو گیا۔ امی کی طبیعت خراب تھی اس لئے وہ نہ جا سکیں۔ میری ایک ہی خالہ تھیں بے چاری"

"اوہ کیا ہوا تھا آپکی خالہ کو۔۔؟" خاتون اب ازراہ ہمدردی اس کے قریب آن بیٹھی تھیں۔

"بس یوں ہی۔۔ یوں سمجھ لیجئے کہ عمر کا تقاضہ تھا۔ امی سے تو کافی بڑی تھیں۔ تقریباً آٹھ سال۔۔" وہ بالکل نارمل آواز میں بولی۔۔

"آپکے ساتھ......"

"جی نہیں میں اکیلی آ رہی ہوں۔ دراصل میرے والد کا ایک سال ہوا انتقال ہو چکا ہے۔ اور کوئی بڑا بھائی بھی نہیں۔ بس دو چھوٹے بھائی ہیں۔" برقعے ڈر کر اس نے اپنے اکیلے سفر کی وضاحت کی۔ "اور آپ کے ساتھ۔؟"

"میرے ساتھ۔۔" خاتون نے پلکیں جھپکائیں "میرے شوہر ہیں۔۔" وہ بے باکانہ ہنسی اور یہ جملہ اس نے یوں ادا کیا جیسے اس کے آدھے الفاظ جھوٹے ہوں۔

اب وہ کافی گھل مل گئی تھیں اور ادھر ادھر کی بے شمار باتیں انھوں نے اس دوران کر ڈالی تھیں۔ بالکل بے تکلف سہیلیوں کی طرح۔

"میرا نام شاہدہ ہے"

"اور میرا نام ــــ ...... مجھے زمرد، جان، بیگم، خانم.... آگے جو آپ کا دل چاہے لگالیں"

وہ ہنسی تو وہ بھی ہنسنے لگی۔

زمرد نے اس کا ہاتھ بڑی ہی اپنائیت سے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور اسے باتوں کے دوران ہلکے ہلکے دبانے لگتی۔

بہت سی چمکتی انگوٹھیاں ــ بڑا ہی خوبصورت ہاتھ تھا ــ گورا گورا ــ نرم نرم ــ اسے اس کا ہاتھ بہت اچھا لگا ــــ وہ اسے ساری ہی اچھی لگ رہی تھی سوائے اس کے ہونٹوں کے جو بے حد سرخ تھے اور بتی کی روشنی میں خوب چمک رہے تھے۔ اکیلے پن کے دور ہو جانے کی وجہ سے یا ــ زمرد کے بار بار کھکھلا کر ہنس پڑنے کی وجہ سے، یا جانے کیوں ــــ زمرد کی موجودگی اسے بہت ہی خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہنے لگا ــــ وہ یوں ہی ساری عمر ــــ اس سے لگی بیٹھی رہے۔

ہلکی ہلکی مسحور کن خوشبو ــ ریشمی برقعے کی نرم سی سرسراہٹ آنچ دیتی ہوئی سی ــ اس کا دل چاہا ــــ وہ بھی برقعہ اوڑھ لے۔ برقعے میں تو رنگ ذرا اور بھی گورا لگنے لگتا ہے نا ــ سردی کا وہ احساس جو کچھ دیر پہلے ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں نے پیدا کر دیا تھا اب وہ بالکل ختم ہو گیا تھا۔

باوجود کوشش کے اسکی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

"نیند آ رہی ہے شاہدہ؟"

وہ مسکرا دی۔

"لیٹ رہو ــ برتھ تو خالی پڑی ہے"

"نہیں بس یونہیں ــــ نیند تو نہیں آ رہی ــ"

کچھ دیر یونہی گزر گئی ــــ پھر تو واقعی اسکی آنکھیں بند ہونے لگیں ــــ زمرد نے اس کا سر دھیرے سے اپنے کاندھے سے ٹیک دیا۔

بے پناہ پیار تھا ــ اپنائیت تھی ــــ اور پھر خوشبو ــــ جو نیند بن بن کر اسکی آنکھوں سے ٹکرا رہی تھی ــــ پھر وہ سچ مچ سو گئی۔

کراچی آیا ــ تو انھوں نے ایک دوسرے کو بہت ہی گہری سہیلیوں کی طرح خدا حافظ کہا ــ پھر زمرد ــــ ایک انتہائی اجلے کپڑوں والے گندمی رنگ کے آدمی کے ساتھ چلی گئی جسے اس نے اپنا شوہر بتایا تھا۔

گھر پہنچ کر شاہدہ بھی ایسی پریشانیوں میں گھری کہ یکسر زمرد کو بھول گئی ــــ گو وہ ایسے لوگوں میں سے تھی۔ جن سے اگر ایک بار مل لیا جائے تو پھر انھیں بھلایا نہیں جا سکتا۔ مگر یہاں تو پریشانیاں ہی کچھ ایسی تھیں۔ خالہ کی موت نے ماں کو اور بھی دکھی اور اداس کر دیا تھا اور انکی طبیعت پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ تھوڑی سی جمع شدہ پونجی جو اسکی شادی کے نام پر رکھی گئی تھی ــــ ماں کی بیماری پر خرچ ہو گئی تھی۔ ماں کی سلائی وغیرہ سے جو کچھ آمدنی ہو رہی تھی۔ وہ بھی بند ہو گئی تھی۔ بچی کھچی رقم اس کے حیدر آباد کے سفر کی نذر ہو گئی۔ مگر جانا تو بہر حال ضروری تھا آخر کو خالہ تھی اور وہ بھی ایسی محبت کرنے والی۔

نوبت یہاں تک آ پہنچی تھی کہ اب گھر میں کھانے کو بھی کچھ نہ رہا۔ اپنی گھڑی وہ پہلے ہی فروخت کر چکی تھی۔ اب تو بیچنے کو بھی کچھ نہ بچا تھا۔ اس نے کالج جانا بند کر دیا اور نوکری کی تلاش میں ہمہ تن جٹ گئی ــ مگر کسی اسکول میں جگہ نہ ملی۔ وہاں تو گریجویٹ لڑکیاں یونہی ماری ماری پھر رہی تھیں بھلا اسے کون پوچھتا تھا۔ انٹر کی طالبہ کو اسکولوں سے تنگ آ کر اس نے ایک دو دفتروں میں کوشش کر دیکھی۔ کچھ ایک دو جان پہچان والی لڑکیاں دفتر میں کام بھی کرتی تھیں مگر کسی کی وساطت بھی کام نہ آ سکی۔

اور آج جب موٹے منیجر نے اس کے چہرے پر لکھی ہوئی مجبوریوں کو پڑھنے کے بعد اسے کچھ معنی خیز جملے کہے ــ تو غصہ اور نفرت سے اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے "شام کو کوٹھی پر چلئے گا ــ" یہ جملہ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اس کے کانوں میں اتر گیا تھا۔

"حرامزادہ ــــ" اس کا جی چاہا اور بھی بہت سی گالیاں دے۔ مگر اس سے آگے اس نے اسے کوئی گالی نہ دی ــ چپ چاپ وہاں سے چلی آئی۔

مگر راستہ چلتے میں کئی بار اس کا دل چاہا ــــ واپس چلی جائے اور اس کے منہ پر اتنا تھوکے کہ ذلت کا سارا احساس اس کے دل سے نکل کر اس کے منہ پر لکھ جائے وہ ایسی لڑکیوں میں سے نہیں تھی ــ جو معنی خیز مسکراہٹوں کا مطلب سمجھتی ہوں، نہ اسے کوئی ایسی چالیں ہی آتی تھیں وہ تو بس بڑی سادہ سی لڑکی تھی۔ ایسی کم عقل اور بھولی بھالی جیسے شریف گھرانوں کی اکثر لڑکیاں ہوتی ہیں۔ زندگی میں پہلی بار اپنے معصوم خوابوں سے چونک کر اسے زندگی کی بے درد حقیقتوں سے پالا پڑا تھا اور اسی لئے شاید ہر ہر قدم پر اسکی آنکھ سے آنسو نکل رہے تھے۔

اور جب کالی کار بدستور اس کا پیچھا کرتی رہی تو تنگ آ کر وہ سچ مچ ہی رو دی۔ پر رونق سڑک تھی۔ اس نے ڈر کر جلدی سے آنسو پی لئے۔

"مر جائے ــ مر جائے خدا کرے۔ کمینہ ــ کیا پہلے سے کچھ کم دکھ ہیں خدایا۔ جو مصیبتیں اور پیچھے پڑ جاتی ہیں۔ خدا کرے میرا صبر پڑے تجھ پر۔ اس نے دل ہی دل میں بڑی ہی بے بسی سے کار میں بیٹھے ہوئے خوش پوش بے فکرے نوجوان کو بددعا دی ــ جو کئی دنوں سے ہر روز اس کا پیچھا کر رہا تھا۔

کئی بار راستہ چلتے چلتے اس کا دل چاہا ــ لب سڑک بیٹھ کر خوب ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ بھاری بھاری قدموں سے جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو دہلیز پر قدم دھرتے ہی اسے ماں کی دردناک کھانسی کی آواز سنائی دی ــــ اس کا دل دہل کر رہ گیا ــ اف خدایا ــ کیسی مصیبتوں بھری زندگی ہے، نہ جانے کیا ہونے والا ہے ــ"

"آپا ــــ! ہمارا نام اسکول سے کٹ گیا آج ــ فیس بھی نہیں لائیں آپ؟" انور، مظہر نے یہ پہلی خوش خبری تھی جو اسے سنائی۔

"بہت اچھا ہوا ــ" یہ ایک مصیبت تو ختم ہوئی آخر ــ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ مگر اور بھی تو بہت سی مصیبتیں تھیں۔ اور سب سے بڑی مصیبت تو خود "یہ بھوک" تھی ــ ماں کو دوائی کی ضرورت تھی ــــ اور ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق پھلوں اور اچھی خوراک کی۔ مگر یہاں تو دو روز سے چولہا ہی نہ جلا تھا۔ ماں کیسی سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھیں۔ عجیب سی صورت نکل آئی تھی۔ جب وہ ایک نظر ان پر ڈالتی تو بس دل دہل کر رہ جاتا۔

اور پھر بے چارے انور مظہر بھی تو بھوکے تھے۔ ننھی سی جانیں ــ خود اسے بھوک سے اتنی نقاہت محسوس ہو رہی تھی کہ ایک قدم بھی اب چلا نہ جاتا تھا۔

"کیا کروں ــ کیا کروں" کچھ بھی تو سمجھ میں نہ آتا تھا ــ یا خدا کوئی غم گسار بھی تو نہیں ہے اس دنیا میں ــــ کتنی بڑی دنیا ہے یہ کتنے سارے لوگ ہیں یہاں مگر سب اپنی اپنی خوشیوں میں لگے ہیں۔ بھلا کسی کو کسی کے دکھ کی کیا پڑی۔ جو چور دل کی طرح دبے قدموں غسل خانے کی طرف جانے لگی۔ مگر ماں نے شاید آہٹ سن لی تھی۔

"کیا ہوا بیٹی کچھ صورت بنی ــــ؟" وہی سوال ــ روز والا ــ جس کا اس کے پاس سوائے خاموشی کے کوئی بھی تو جواب نہ تھا۔

وہ چپ رہی۔

پھر ماں کھانسنے لگی ــــ اور وہ غسل خانے چلی گئی۔

"آپا آج تو بڑے زور کی بھوک لگی ہے ۔" انور بولا ۔ "آپ نے صبح کہا تھا آپ کھانا لانے جا رہی ہیں ۔ آپا آپ نے جھوٹ بولا تھا نا" مظہر نے شکایت کی ۔

"مجھے کھا لو ۔ مجھے کھا لو ۔ لو !!" وہ پھٹ پڑی

دونوں بچے سہم کر پیچھے ہٹ گئے ۔ "آپا تو غصہ میں ہیں" ایک نے دوسرے سے سرگوشی میں کہا ۔ اور بڑی ہی بے چارگی سے ماں کے کمرے کی طرف چل دیئے ۔

وہ خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی ۔ پھر وضو کر کے نماز پڑھنے لگی ۔۔۔ لیکن سکون پھر بھی نہ ملا ۔ بھوک اپنی جگہ موجود تھی ماں کی بیماری اپنی جگہ قائم ۔

"اللہ میاں ۔ یا تو تو مجھے عزت کی زندگی دے ۔ یا موت ہی دے دے میں کوئی آوارہ لڑکی تو نہیں ہوں ۔۔۔ اللہ میاں پھر کیوں لوگ یوں کہتے ہیں ۔"

جائے نماز تہہ کر کے ایک طرف رکھنے کے بعد وہ رو دھو کر اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی ۔ بالکل خالی الذہن ۔۔۔ کیا کرے ۔۔۔ کیا نہ کرے ۔ اس کا سارا احساس گویا آنسوؤں میں بہہ گیا تھا ۔

سامنے گلی میں ویسی ہی چہل پہل تھی ۔ ہمیشہ کی طرح آمد و رفت جاری تھی لوگ آ رہے تھے ۔ لوگ جا رہے تھے ۔ خوش خوش مگن مگن ۔ مشغول ۔ مصروف ۔ مغموم ۔ ہر طرح کے لوگ چاروں طرف بکھرے پڑے تھے ۔ ایک دوسرے سے بے نیاز ۔ بس اپنے آپ میں مگن ۔

کیا اتنی بڑی دنیا میں ۔ اتنے بہت سے لوگوں میں ۔ کوئی بھی ہمارا نہیں خدایا ۔۔۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی ۔

"ارے ۔" تب ہی وہ دفعتاً کہہ اٹھی ۔

زمرد برقع کی باریک نقاب ڈالے جھلملاتا ہوا پرس جھلاتی ۔ سامنے سے چلی آ رہی تھی ۔ یہ وہی تھی ۔ بالکل وہی ۔ اس کا گورا گورا چہرہ نقاب کے اندر سے صاف جھلک رہا تھا ۔ سرخ ہونٹ ۔۔۔ اور ہاتھوں میں چمکتی انگوٹھیاں اسے یوں لگا جیسے اس کے مہربان خدا نے اسکی دعا سن لی ہو ۔ اور اسکی مدد کیلئے گویا آسمان سے کوئی فرشتہ نازل کر دیا ہو ۔

زمرد نے اسے دیکھا ۔ نقاب کے اندر سے ۔ وہ ذرا ٹھٹکی ۔۔۔ پھر مسکرائی ۔ اپنے خاص انداز سے ۔ اور پھر اس نے نقاب الٹ دیا ۔

کھٹ کھٹ کھٹ ۔ وہ سیڑھیاں چڑھتی اوپر آن پہنچی تھی ۔ اور پھر بے اختیار وہ اس کے گلے سے لپٹ گئی ۔ اور پھوٹ پھوٹ کر روئی ۔ بالکل دیرینہ دوستوں کی طرح ۔

"ارے شاہدہ ۔۔۔ میرے اتنے قریب ۔۔۔ مجھے خبر تک نہیں ۔ یہ تمہارے بالکل پاس والا گھر ہی تو ہم نے لیا ہے ۔ ایک ہی تو دیوار ہے ۔"

شاہدہ اس کے اس انکشاف پر حیران رہ گئی ۔ وہ تو اپنی مصیبتوں میں ایسی الجھی تھی کہ اپنے دکھوں کے سوا ۔ سب کچھ بھول گئی تھی ۔ ارد گرد کی تو کچھ خبر ہی نہ تھی ۔

پھر وہ اسے ہنسانے لگی ۔ "ارے یہ گلابی گلابی آنکھیں ۔ کیا قیامت لگ رہی ہیں حضور ۔"

وہ بھی ہنس دی ۔ آج اتنے دنوں بعد پہلی بار اس کا جی ہنسنے کو چاہا تھا ۔

شاہدہ نے سب کچھ اس سے کہہ دیا ۔ اور جب کالی کار والے نوجوان کے بارے میں اسے روتے ہوئے بتایا ۔ تو وہ بولی ۔

"ارے بنو ۔ بھلا اس میں رونے کی کیا بات ہے پگلی ۔" بڑی دیر تک وہ اسے تسلیاں دیتی رہی ۔ پھر اس کا بازو پکڑ کر اپنے فلیٹ میں لے گئی ۔

گھر بڑی شائستگی سے سجایا گیا تھا ۔ ہر شے بے داغ اور انتہائی اجلی اجلی ۔۔۔ اور دھلی دھلی ۔ سلیقہ اور ہنرمندی نے معمولی گھر کو چار چاند لگا دیئے تھے ۔ دیواروں پر خوبصورت تصاویر ۔ اور گلدانوں میں تر و تازہ پھول ۔۔۔ اس کے ذوق سلیم کا ثبوت دے رہے تھے ۔

زمرد نے اسکی کافی مدد کی ۔ اسے تسلیاں بھی دیں ۔ وہ اسکی نرمی اور اخلاق سے بے حد متاثر ہوئی ۔ اگر کوئی ماں جائی بہن بھی ہوتی تو شاید اتنا نہ کر پاتی ۔

اب وہ ذرا سکون سے سروس کی تلاش میں جانے لگی تھی ۔ اخبار میں دیئے گئے نت نئے اشتہاروں پر ۔ نئے نئے اسکولوں میں ۔۔۔

کالی کار بدستور اس کا پیچھا کر رہی تھی ۔ "چلیئے گا ۔" وہ جب بھی یہ فقرہ سنتی اس کا جی چاہتا ۔ اس نوجوان کا منہ نوچ لے ۔

"کیا میں آوارہ لگتی ہوں ۔۔۔ ؟" جب بھی وہ اس بات کا ذکر زمرد سے کرتی ۔ وہ ہنس پڑتی ۔

ماں کی حالت تھی کہ بگڑتی ہی جا رہی تھی ۔ مہینہ ختم ہونے کو تھا ۔ دودھ والا دھوبی ۔ مکان کا کرایہ ۔ بجلی کا بل ۔ اور یہ سارے بل ۔ سانپوں کی طرح پھنکار پھنکار کر اس کا سکون برباد کئے دے رہے تھے ۔ زمرد نے اسکی کتنی مدد کی تھی ۔ مگر آخر کہاں تک ۔ پرسوں سے پھر راشن بھی ختم ہو گیا تھا ۔

آخر زمرد کو کہاں تک پریشان کروں ۔۔۔ خدایا کیا کروں ۔" وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی ۔ ماں کی کھانسی میں اب وہ موت کی بھیانک آواز صاف سن سکتی تھی ۔ جو اس کے دروازے پر دستک دینے والی تھی ۔

اگر کچھ روز اور دوا نہ آئی تو ۔ ۔ ۔ تو ۔ ۔ ۔ تو ۔ ۔ ۔ وہ لرز گئی ۔

"آپا بھوک لگی ہے ۔" مظہر نے ہانک لگائی ۔

"ہاں آپا ۔ بہت زور کی بھوک لگی ہے ۔" انور نے بھی تائید کی ۔

گھبرا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی ۔ اور دروازہ کھول کر زمرد کی طرف چل دی ۔۔۔ کہ اچانک زمرد کے گھر سے نکلنے والے آدمی سے ٹکرا گئی ۔

اس نے نظر اوپر اٹھائی ۔

"چلیئے گا ۔" اف ! یہ تو وہی تھا ۔ اسکی تو بس چیخ ہی نکلتے نکلتے رہ گئی ۔ وہ دھم سے دروازہ کھول کر زمرد کے گھر میں جا پڑی ۔

کار اسٹارٹ کرنے کی آواز صاف اوپر آ رہی تھی ۔

زمرد گاؤ تکیے سے لگی ۔ اجلی اجلی چاندنی پر ۔ بڑے ہی اطمینان سے پان چبا رہی تھی ۔ اسکی آنکھوں میں گلابی ڈورے اسے اور بھی خوبصورت بنا رہے تھے ۔

"زمرد ۔ یہی تو تھا وہ کمینہ ۔۔۔ جو میرے پیچھے لگا ہے ۔ یہ یہاں کیوں آیا تھا ۔ کون ہے یہ ؟" وہ سخت دہشت زدہ تھی ۔۔۔ زمرد نے ایک ادائے دلبرانہ سے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے اپنے پہلو میں گرا لیا ۔

وہ ہنسی ۔۔۔ ایک عجیب سی معنی خیز ہنسی ۔۔۔

بھلا وہ اس تو عمر بے وقوف سی لڑکی کو کیا بتاتی کہ وہ کون تھا ۔ اس کا سب سے شاندار گاہک ۔ خوب ہی موٹا آسامی ۔۔۔ اور پھر خوبصورت بھی ۔۔ اسے کیا پتہ کہ یہ گھر اس کے لئے کتنا بابرکت ثابت ہو رہا تھا ۔ پولس کے چھاپے کے خوف سے بھاگ کر جب اس نے اپنا پہلا گھر چھوڑا تو اس محلے میں وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ تو ایک روز بھی گزارہ نہ کر سکے گی ۔ سخت شریفوں کا محلہ ۔ مگر یہاں تو وہ اور بھی محفوظ ہو گئی تھی ۔

کسی کو اس پر شبہ تک نہ ہوا ۔ اس مولوی ٹائپ عزیب سے محلے میں جہاں چاروں طرف دکھ ہی دکھ تھے کسی کو بھلا کسی کی کیا پڑی تھی ۔

دھندا خوب چل رہا تھا ۔ اور گاہک شرفا کے اس محلے میں ایک شریف "برقعہ پوش خاتون" کے یہاں جانے میں جھجکتے بھی نہ تھے ۔۔۔ پھر بھی وہ بہت محتاط تھی ۔ دن کی روشنی میں تو کبھی کبھی ہی کوئی سخت ضرورت کا مارا چلا آتا ۔۔۔ ورنہ ہمیشہ رات کے اندھیرے ہی اس کے رازدار تھے ۔ اور رات کے اندھیروں

میں کتنی سیاہیاں پھیلی ہیں۔ اس کا کسے پتہ۔

شاہدہ کا دل اب زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اپنے پہلو میں وہ اس کے نوخیز دل کی دھڑکن کو بخوبی سن رہی تھی۔

"ارے میری جان —— تو اس میں رونے کی کونسی بات ہے" ایک عشاق کھلاڑی کی طرح اس نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اسکی سرخ سرخ مسکراہٹ شاہدہ کے تمام چہرے پر بکھرنے لگی۔ اف یہ کیا تھا ——

کیا... کیا!... کیا... اندھیرا —— نا اجالا... نا اندھیرا... شاہدہ سن ہو کر رہ گئی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ اسکی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ وہ رونا بھی بھول گئی۔ اس کے آنسو تھم گئے۔ ایک گہری خاموشی چھا گئی تھی۔

اسے لگا جیسے اس کے آنسو —— زمرد کے متحرک ہاتھوں کی انگلیوں کے انگوٹھیوں کے نگینوں میں جم گئے ہوں —— چمکتے ہوئے پتھر —— یہ انگوٹھیاں۔ یہ نگینے۔ یہ چمک —— یہاں یہاں —— یہاں ——

یہ ایک سحر تھا —— ناقابل بیان —— ناقابل یقین۔ وہ چاہتی تھی یہاں سے نکل بھاگے۔ مگر یوں لگتا تھا کہ اہیں ذرا سی حرکت تک کرنے کی قوت بھی سلب ہو گئی ہے جیسے ان ہاتھوں میں کوئی شدید قوت چھپی ہو۔

خود اس کا وجود —— اس کا جسم اسکے خلاف ہو گیا تھا اور اسے اٹھنے نہ دیتا تھا۔

وہ یونہی پڑی رہی —— بے بس، زخمی چڑیا کی طرح —— سرخ مسکراہٹ —— اس کے سارے جسم میں بہہ گئی تھی —— انگوٹھیوں کے نگینے چمک چمک کر اسکی آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے۔

نصف گھنٹہ کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ اب ہر حس اپنا تاثر کھو چکی کوئی احساس باقی نہ رہا تھا۔

خوشگواری —— ناخوشگواری

دوسری صبح جب وہ تیار ہوئی تو اس نے بڑی احتیاط سے زمرد کا سیاہ برقع استری کیا۔

"بیٹی کچھ دعا پڑھ کر جاؤ۔ شاید خدا کو ہم پر رحم آجائے اور کوئی کام بن جائے"

"بن جائے گا ماں" اس نے برقع کے بٹن لگاتے ہوئے اطمینان سے کہا

"آپا! آج تو آپ پیسے لائیں گی نا۔؟"

"ہاں ——"

"ضرور ——"

"ضرور منے"

برقع اوڑھ کر اس نے آئینہ دیکھا۔ اور پھر دروازے سے باہر نکل گئی۔

"آج آپا کھانا ضرور لائیں گی انور" منظر نے تالی بجائی۔

"ہاں۔ ضرور ——!" انور نے تائید کی

وہ اب گلی کے موڑ پر پہنچ چکی تھی اور اس نے نقاب الٹ دیا تھا۔

"چلیے گا" کالی کار میں سے نوجوان نے سر نکال کر کہا۔

زمرد نے کھڑکی میں سے سر نکال کر نیچے جھانکا اور ——

برقع پوش خاتون کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ بکھر گئی —— سیاہ اور قاتلانہ مسکراہٹ —— اس نے دیکھا۔

شاہدہ کار میں بیٹھ چکی تھی۔

دوسرے ہی لمحے —— کار تیز رفتار کی گلی میں دھول اڑاتی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ٭

باقر رضوی

تحمل

حالِ دل ان کو کسی طرح سناتے نہ بنا
بات کرتے نہ بنا آنکھ ملاتے نہ بنا

آگیا بھوک سے دم توڑتی دنیا کا خیال!
تر نوالہ بھی ہمیں چین سے کھاتے نہ بنا

مرگِ انبوہ کے اک جشن میں ہم بیٹھے تھے
ڈوبتی ناؤ سے تنہا نکل آتے نہ بنا

پھول نکلے تو سبھی خوں میں نہائے نکلے
گلستاں اب کے بہاروں سے سجاتے نہ بنا

ہم نے سوچا تھا اٹھالیں گے گلستاں سر پہ!
جب بہار آگئی تب دھوم مچاتے نہ بنا

جادۂ زیست کی یہ بھول بھلیاں توبہ!
خضر و الیاس سے بھی راہ سجھاتے نہ بنا

ظہیر بیدری

سرمایہ داری کی لاش دفن کرو!

علم سیاست کے مفکرین ہابس، جان لاک اور روسو نے ریاست کی ابتدا سے متعلق اپنے نظریات میں ریاست کی تشکیل سے پہلے ایک زمانۂ فطرت کا تصور پیش کیا ہے زمانہ فطرت میں جبکہ ریاست نام کی کوئی تنظیم موجود نہیں تھی لوگ اپنے عمل میں بالکلیہ آزاد تھے۔ ہر شخص کو رہنے سہنے کھانے پینے اور کام کی مکمل آزادی تھی۔ زمین کی ہر چیز پر ہر انسان کا برابر کا حق تھا۔ نہ اس دور میں کوئی سرمایہ دار تھا نہ کوئی مزدور۔ اس لئے کہ ملکیت کا اس دور میں کوئی تصور موجود نہ تھا۔ دوسرے معنوں میں یہ دور ایک ابتدائی اشتمالی دور تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ لوگوں میں ملکیت کا احساس پیدا ہوتا گیا۔ یہیں سے انسان میں تفریق شروع ہوگئی اور سماج، طبقوں میں بٹنے لگا۔ لہٰذا یہ خیال اپنی جگہ یقیناً درست معلوم ہوتا ہے کہ دولت کی غیر مساوی تقسیم کا سبب ذاتی ملکیت ہے اور یہی ذاتی ملکیت انسان کو شیطان اور دنیا کو جہنم بنا دیتی ہے۔ یورپ میں جاگیردارانہ نظام کے مظالم، بھاپ کی دریافت سائنسی ترقی اور مذہب کے ختم ہوتے ہوئے اثر کی وجہ سے ہمہ گیر نظام زندگی کے فقدان نے اس سرمایہ دارانہ نظام کو جنم دیا جو آج دنیا میں ایک بدترین عذاب کی شکل میں موجود ہے۔ اس نظام کا خاص محرک "ذاتی منفعت" ہے جس میں ہر شخص کو سب سے زیادہ خیال اپنے ذاتی مفاد کا ہوتا ہے اور ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اسی ذاتی منفعت اور مسابقت کی دھن میں انسان انسانیت، اخلاق، محبت، ہمدردی، خلوص سب کو بھول کر درندہ بن جاتا ہے جسکا مشاہدہ ہم آج کی دنیا میں ہر ہر قدم پر کر سکتے ہیں۔ اس ظالمانہ نظام نے جس کی بنیادیں ظلم، ناانصافی، لوٹ اور غریب کے استحصال پر استوار کی گئی ہیں۔ دنیا میں ایسی تباہی پھیلائی اور غریب کی زندگی کو اتنا مشکل بنا دیا ہے کہ زندہ انسان ہر وقت موت کی دعائیں مانگا کرتا ہے۔ اس نظام کے حامی انسانی آزادی کا جھوٹا دعویٰ کرتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت ہی ایک ایسا نظام معیشت ہے جو دنیا میں انسان کی آزادیاں برقرار رکھتے ہوئے دنیا کو جنت بنا دیتا ہے!! کاش یہ مفکرین آج زندہ ہوتے اور اپنی آنکھوں سے اس نظام کی نام نہاد خوبیاں دیکھتے۔! اس نظام معیشت کے حامیوں کے مطابق انسان کو صرف کی آزادی، محنت کی آزادی، ملکیت کی آزادی ملکیت کی آزادی، کاروباری آزادی دیجاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ بعض احمقوں کی جنت میں رہنے والے مفکرین نے (پتہ نہیں انھیں مفکرین کس لئے کہا گیا) صارف کو اس نظام کا بادشاہ کہا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان داناؤں نے لفظ "بادشاہ" کو یہاں "بھکاری" کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ کیونکہ آج کا عام آدمی اس سماج میں بھکاری سے بدتر ہو کر رہ گیا ہے۔ اس بدترین نظام نے جو آج کی ترقی یافتہ دنیا کے حسین چہرے پر کوڑھ بن گیا ہے انسانوں کو صرف کی آزادی تو دی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا صرف کی آزادی سے صارف حقیقتاً کچھ فائدہ اٹھا سکتا ہے؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ملے گا۔ صرف کی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان اپنی پسند کی چیز خریدنے میں آزاد ہے۔ اسکی اس آزادی پر سماج یا حکومت کی کوئی پابندی عائد نہیں ہوگی ان معنوں میں تو یقیناً ہر شخص کو صرف کی آزادی حاصل ہے۔ لیکن ذرا اس آزادی کی اصلیت اور حقیقت پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ آزادی صرف ان مفکروں کے ذہن اور انکی کتابوں کے علاوہ کہیں نہیں ملتی۔ آج سماج کی ساری دولت مٹھی بھر سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں جمع ہے۔ صرف کی آزادی سے صرف یہی مٹھی بھر سرمایہ دار فائدہ اٹھا سکتے ہیں باقی کروڑوں عوام تو اس قابل بھی نہیں کہ دو وقت کی روٹی ہی حاصل کرلیں۔ ہمارے سماج میں مزدوروں کی کمائی ہوئی دولت پر سانپ بن کر بیٹھنے والے یہ سرمایہ دار مزدوروں کو (جانوروں کی طرح محنت کرنے کے باوجود) اتنا معاوضہ بھی نہیں دیتے کہ انکی بنیادی ضروریات ہی پوری ہوجائیں۔ ظاہر ہے کہ جب انسان کو اتنا پیسہ بھی نہ ملے کہ وہ دو وقت کی روٹی ہی خرید سکے تو پھر ایسی "آزادی صرف" سوائے "بکواس" کے اور کیا ہو سکتی ہے۔ ٹالسٹائی نے خوب کہا ہے کہ "الف لیلیٰ کے سمندری بوڑھے کی طرح برسر اقتدار طبقہ سرمایہ دار غریب کی پیٹھ پر بری طرح سوار ہیں۔ وہ غریب کو زندہ رکھنے کے لئے قدرے خوراک بھی دیتے ہیں کچھ کچھ تعلیم بھی دیتے ہیں۔ انھیں قدرتی نظاروں سے لطف اندوز ہونے کا ڈھنگ بھی بتلاتے ہیں حتیٰ کہ آزادی حاصل کرنے کے گر بھی سکھاتے ہیں۔ سب کچھ کرتے ہیں لیکن اسکی پیٹھ پر سے اترنے کا نام بھی نہیں لیتے"۔

اسی طرح محنت کی آزادی کو لے لیجئے اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی محنت کو اپنی مرضی سے جس طرح چاہے استعمال کر سکتا ہے۔ لیکن محنت کی آزادی دراصل اس نظام کا سب سے ظالمانہ پہلو ہے۔ محنت ہر جگہ مجبور و بے بس ہے اس نظام میں انسانی محنت بھی جنس کی طرح بازار میں خریدی اور بیچی جاتی ہے۔ اور پھر یہی ایک ایسا مظلوم عامل پیدائش ہے جس میں مول تول کی قوت نہ ہونے کے برابر ہے محنت کار سماج میں ہمیشہ اشیاء صرف کے انبار لگا کر خود بھوکا ننگا اور بے گھر رہتا ہے۔ مزدور جتنے گھنٹے کام سے الگ رہتا ہے اس کے یہ گھنٹے بے کار جاتے ہیں۔ آج پسماندہ ملکوں کا سب سے بڑا مسئلہ بے روزگاری کا مسئلہ ہے۔ ہر طرف مزدور اپنی محنت کو لے کر سرمایہ داروں کے کارخانوں کے چکر کاٹتے نظر آتے ہیں لیکن اکثر انکی محنت کوڑیوں کے مول خریدنے پر بھی کوئی تیار نہیں ہوتا۔ دراصل بے روزگاری اس نظام کا ایسا عطیہ ہے جو اس نظام کے باقی رہنے تک باقی رہے گا۔ مکمل روزگار کا حصول اس سماج میں قطعی ممکن نہیں۔ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی اس لعنت پر اب تک قابو نہ پایا جا سکا۔ تیسرا حق ملکیت ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو اس بات کی کھلی آزادی ہے کہ وہ دولت اور جائیداد کی شکل میں جتنی چاہے ملکیت رکھ سکتا ہے۔ لیکن درحقیقت اس آزادی کا مطلب صرف یہ ہے کہ سرمایہ داروں کو غریب کا استحصال کر کے زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ غریب کے لئے تو یہ آزادی ایک

مذاق کے سوا کچھ نہیں۔ اب غریب مزدور کی ساری زندگی تو روٹی حاصل کرنے کی جدوجہد میں ختم ہو جاتی ہے پھر ملکیت کا اس کے لئے سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے اسی طرح کاروباری آزادی کا معاملہ ہے غریب صرف اپنی محنت کا مالک ہے۔ وہ صرف اپنی محنت سے ہی اپنی زندگی کے بقا کے سامان کرتا ہے۔ کاروبار کے لئے تو سرمایہ چاہیئے جو ایک غریب کی پہنچ سے باہر ہے۔ اس طرح اس آزادی سے بھی صرف سرمایہ دار ہی مستفید ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ملک کی ساری دولت جو صرف محنت کار کی کاوشوں کا نتیجہ ہوتی ہے ان خطرناک درندوں کے ہاتھوں میں ہے جو اپنے انجام سے بے خبر اپنی دولت کے اضافے میں لگے ہوئے ہیں سرمایہ دارانہ نظام کے ایک حامی مسٹر کینس کا کہنا ہے کہ " ہم جس سماج میں رہتے ہیں اسکی نمایاں غلطیاں یہ ہیں کہ وہ مکمل روزگار فراہم کرنے میں ناکام رہا ہے اور جبری طور پر نامناسب طریقے سے دولت و آمدنی کی تقسیم کرتا ہے۔" پھر وہ کہتا ہے " یہ بات یقینی ہے کہ دنیا زیادہ عرصے تک بے روزگاری کو برداشت نہ کر سکے گی۔ جو موجودہ سرمایہ دارانہ نظام سے منسلک ہے اور میرا خیال ہے کہ ناگزیر طور پر منسلک ہے۔" حقیقت یہ ہے کہ جب تک اس سماج کی ساخت میں بنیادی تبدیلی نہیں کی جاتی اس دنیا میں ظلم زیادتی، لوٹ کھسوٹ اور طبقاتی تقسیم کا بے ہودہ چکر چلتا رہے گا اگر دنیا کے کروڑوں غریبوں مزدوروں کو انکا جائز حق مل سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ نجی ملکیت کا حق ختم کر کے وسائل پیداوار کو قومی ملکیت میں لے لیا جائے۔ خود اس نظام کا زبردست حامی کہتا ہے کہ "کسی حد تک وسیع نوعیت کی سرمایہ کاری کو سماجیانے کی پالیسی ان تمام امراض کا علاج ثابت ہو سکتی ہے جو اس نظام معیشت کے جسم سے چمٹے ہوئے ہیں" ہمارے اکثر رہنما عوام کو یہ کہکر بے وقوف بناتے رہتے ہیں کہ جلد ہی ان کے سارے مسائل حل کر دیئے جائیں گے۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم ختم کر دی جائے گی دنیا کو جنت بنا دیا جائے گا وغیرہ۔ دراصل یہ ایک فریب ہے جو سرمایہ داروں کے یہ ایجنٹ عوام کو دیتے رہتے ہیں۔ تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ عرصہ تک اقتدار سے چمٹے رہ سکیں۔ حقیقت میں یہ سرمایہ داری کی جڑیں مضبوط کر رہے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام میں مشینی طریقہ کار کا لازمی نتیجہ صنعتوں کے ارتکاز کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور یہ ارتکاز اس وقت تک بڑھتا رہے گا جب تک کہ چھوٹے چھوٹے صنعتکار ختم ہو کر چند سرمایہ داروں کے مزدور بن جائیں گے۔ اس طرح درمیانی طبقہ ختم ہو جاتا ہے اور صرف سرمایہ دار اور مزدور میدان میں رہ جاتے ہیں۔ جیسے جیسے ارتکاز بڑھتا ہے مزدوروں کی حالت بد سے بدتر ہونے لگتی ہے دوسرے یہ کہ پیداوار کا ماخذ صرف محنت ہے۔ محنت سے جو کچھ پیداوار حاصل ہوتی ہے اس کی قیمت محنت کے نام نہاد معاوضے سے زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن محنت کش کو صرف اتنا معاوضہ دیا جاتا ہے کہ وہ بمشکل زندہ رہ سکے اور باقی سارا منافع سرمایہ دار خود رکھ لیتا ہے حالانکہ کسی طرح بھی وہ اس منافع کا حقدار نہیں۔ ان دونوں باتوں سے سرمایہ دارانہ سماج کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسا سماج ہے جس میں سرمایہ دار اور مزدور طبقہ ہیں۔ سرمایہ دار مزدور کا استحصال کرتا ہے جسکے نتیجے میں طبقاتی کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ یہ صورتِ حال زائد پیداوار کو جنم دیتی ہے۔ سرمایہ دار مزدور کا استحصال کر کے اتنی دولت پیدا کر لیتے ہیں کہ خود ہی اسے استعمال کریں تو ختم نہ ہو۔ لہٰذا وہ مجبوراً اس دولت کو مزید صنعتیں کھولنے میں لگاتے ہیں جسکی وجہ سے پیداوار اور بڑھتی ہے لیکن چونکہ محنت کش کے پاس قوت خرید نہیں ہوتی بلکہ صحیح الفاظ میں قوت خرید دی ہی نہیں جاتی جس کی وجہ سے وہ اپنی ضرورت کی اشیا خریدنے سے قاصر رہتا ہے۔ نتیجتاً سماج میں ہر وقت ضرورت سے بہت زیادہ پیداوار موجود رہتی ہے جس کا کوئی خریدار نہیں ہوتا اور پھر یہیں سے سرمایہ داری کا زوال شروع ہو جاتا ہے اور دراصل سرمایہ داری کے زوال کی ابتدا ہی سوشلزم کی آمد کا اعلان کرتی ہے۔ بڑے بڑے کاروبار کے انہدام کے ساتھ ہی اشتراکی انقلاب شروع ہو جائے گا۔ مزدور طبقہ اپنی طاقت کا اندازہ کر کے صنعتوں کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لے گا صدیوں سے مزدوروں کا خون پینے والے ان درندہ صفت سرمایہ داروں کو صنعتوں سے بے دخل کر دیا جائے گا مزدور خود صنعتیں چلائیں گے اور یہی صنعتوں کے مالک ہوں گے ایک درمیانی عرصہ تک کے لئے مزدوروں کی سخت حکومت قائم رہے گی جو عوام کو سوشلسٹ تعلیم دے کر انھیں اشتمالی نظام کیلئے تیار کر دیگی اس کام کے مکمل ہونے کے بعد مزدوروں کی آمریت اپنے آپ زائل ہو جائے گی سارے کام مزدور انجمنیں سنبھال لیں گی حکومت کی صرف نگرانی رہے گی اور پھر آخری اسٹیج میں حکومت کی نگرانی بھی ختم ہو جائے گی۔

ریاست اور حکومت کے نام کی کوئی چیز معاشرے میں باقی نہیں رہے گی۔ ہر شخص آزادی کے ساتھ اپنا اپنا کام انجام دے گا یہی مکمل اشتمالی دور ہو گا۔ حقیقت میں یہیں سے انسانی تاریخ کا آغاز ہو گا۔ اس سے قبل کا دور ماقبل تاریخ کا دور کہلائے گا۔ سوشلزم کا آغاز اتنا ہی یقینی ہے جتنا شام کے بعد صبح کا آنا۔ اس یقین کی دو بنیادیں ہیں۔ اول صنعتوں کا ارتکاز دوسرے مزدور کا روز بروز بڑھنے والا افلاس۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ یہ یقین بڑی مدت تک صحیح ثابت ہوا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی لعنتوں سے آج دنیا کا بچہ بچہ واقف ہے اور ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اس نظام کو جتنا جلد ہو سکے مٹا دیا جائے۔ لیکن اب بھی مٹھی بھر سرمایہ دار اور ان کے ذلیل ایجنٹ اس مردہ نظام کی لاش کو سینے سے چمٹائے ہوئے ہیں۔

مذہب اسلام نے بھی سرمایہ داری کی کھلی مذمت کی ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ خدا خود کہتا ہے " اور جو جوڑ کے رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اسے اللہ کی راہ میں انھیں خوش خبری سنا دو دردناک عذاب کی " اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ خدا خود دولت کے چند ہاتھوں میں جمع ہونے کو پسند نہیں کرتا۔ دوسری طرف آنحضرت صلعم نے اپنے قول و عمل سے سرمایہ داری کی مذمت کی ہے آپ فرماتے ہیں " پانی آگ اور چراگاہ سارے انسانوں میں مشترک ملکیت رکھتے ہیں۔" اس دور میں نہ بڑی بڑی صنعتیں تھیں اور نہ وسیع پیمانے کے کاروبار یا ملکیت۔ ظاہر ہے پانی آگ اور چراگاہ ہی اس وقت کی اہم ترین چیزیں تھیں جنھیں آپ نے مشترکہ ملکیت قرار دیا۔ خود خدا اور خدا کا رسول ہی جب سرمایہ داری کی مذمت کرتے ہیں تو پھر مذہب کا نام لے کر دولت اور جائیداد پر قبضہ جمانا کہاں کا انصاف ہے؟ لیکن افسوس کہ آج کے "ابن الوقت" مذہب کی تاویلیں اپنے مفاد کے مطابق گڑھ لیا کرتے ہیں۔

آج دنیا کے ہر حصہ میں اس لاش کا تعفن پھیلتا جا رہا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سے پہلے کہ یہ لاش انسانیت کے خاتمے کا باعث بنے اسے دفنا دیا جائے۔ اس نظام کے ایک حامی نے خود اسے آکسیجن خانہ میں رکھی ہوئی لاش سے تعبیر کیا ہے۔ یہ لاش آتنی بھاری ہے کہ صرف مزدور کے مضبوط کندھے ہی اسے قبرستان تک پہنچا سکتے ہیں۔

محبوب (اللہ) مجیب

وفاشعار دلِ بے قرار سے بھی گئے
تمہارے شہر میں اس اختیار سے بھی گئے

عجب طرح سے محبت نے دل کو لوٹ لیا
شعور والے شعورِ بہار سے بھی گئے

حضور آپ کی ہم پہ عنایتیں بسیار
خطا معاف، کہ اس اعتبار سے بھی گئے

یہ اور بات ہے اب بھی نہ مل سکی منزل
خدا گواہ کہ ہم کوئے یار سے بھی گئے

عجب نہیں کہ یہ دل پھر قصور کر بیٹھے
مجیب پھر تو دلِ غم گسار سے بھی گئے

راکھ — صہبا وحید

نگاہ و دل نے شوالے کئی تراشے تھے

خراج جن کو ملا تھا گداز باہوں کا !
شفق لبوں کی ، اجالا غلط نگاہوں کا !

وہی شوالے
وہی آرزو کے الحمرا

کراہتے ہوئے سایوں میں آج ڈوب گئے
سزا فروغِ تمنا کی مل رہی ہے مجھے

دلِ حزیں کی امنگوں کی راکھ باقی ہے
مرے بجھے ہوئے نغموں کی راکھ باقی ہے

نجیب اسلم

شاخوں پہ ہیں پھولوں کے مزار اب کے برس بھی
کرتے رہو زخموں کا شمار اب کے برس بھی
کیا جانیئے کیا کشتیِ امید پہ گذرے
ہر موج ہے طوفاں بہ کنار اب کے برس بھی
خوابوں کے جزیروں میں کئی آس کے پنچھی
اڑتے رہے مانند غبار اب کے برس بھی
ہاں ہم کو تری صورت زیبا سے ہے رغبت
ہاں ہم ہیں ترے غم کا شکار اب کے برس بھی
تا حدِ نظر پھیل چکے یاس کے بادل
آئے گا کہاں دل کو قرار اب کے برس بھی
محرومیِ منزل کی خلش دل میں چھپائے
بیٹھے ہیں سرِ راہ گذار اب کے برس بھی
مہکا نہ کوئی پھول سرِ شاخ تمنا
آیا نہ شگوفوں پہ نکھار اب کے برس بھی

مجبور ہیں جو لوگ نجیب اوڑھے ہیں
اک دیس کے لوگوں کا اتار اب کے برس بھی

خیال جعفری

انسان کی عظمت کے پرستار ہیں ہم لوگ !
یہ جرم اگر ہے تو خطاوار ہیں ہم لوگ !

دنیا ہمیں اس طرح مٹانے پہ تلی ہے !
جیسے کہ کوئی حرف دلآزار ہیں ہم لوگ !

اس جرم پہ پابستۂ زنجیر ہوئے ہیں !
کیوں شب میں اجالے کے طلبگار ہیں ہم لوگ !

کھیتوں کو سناتے ہیں کڑی دھوپ میں نغمے !
میخانے میں اک ساغرِ سرشار ہیں ہم لوگ !

اظہارِ حقیقت ہے اگر جرم تو یارو !
اظہارِ حقیقت کے گنہگار ہیں ہم لوگ !

یہ سلسلۂ مشقِ ستم اب نہ بڑھے گا !
حالاتِ گلستاں سے خبردار ہیں ہم لوگ !

ہم سے کوئی طوفان بھی ٹکرا نہیں سکتا
دیوار نہیں سایۂ دیوار ہیں ہم لوگ !



چاہے وہ ملک کا کوئی بھولا بسرہ کونا ہو یا کوئی دُور افتادہ مقام ہو یا کوئی چھوٹا سا مارکیٹ ہماری خدمات
ہر جگہ مقامی ضرورویات کے عین مطابق ہوتی ہیں۔

جی ہاں چاہے آپ کی تجارت وسیع پیمانے پر ہو یا آپ کا چھوٹا سا کاروبار ہو یونائیٹڈ بینک میں
آپ کی تمام ضروریات انفرادی توجہ کی مستحق سمجھی جاتی ہیں۔

انفرادی خدمت ہمارا پہلا اُصول ہے

UBL یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ

UBL - 27 - 300 - 65 - UD.

سعدیہ حفیظ

کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور....

بات صرف اتنی سی تھی کہ چھوٹی خالہ کل شام کو ماسٹر صاحب کے گھر چلی گئیں آپ کہیں گے انسان ہی انسان کے یہاں جاتے ہیں۔ اجی توبہ کیجئے! قیامت آجاتی تو کچھ اور ہی وجہ تھی۔ اگر معلوم ہوتا اچھے بھلے پرسکون گھر میں۔ ماسٹر صاحب کے گھر جانے سے یہ قیامت اٹھ کھڑی ہوگی تو میں خالہ جان کو ہرگز ہرگز نہ جانے دیتی۔ ہمارے خالو جان تو نہایت ماڈرن اور ایڈوانس قسم کے بزرگ ہیں بیڈ منٹن کورٹ، کلب اور دوستوں کی محفل میں اکثر لڑکیوں کے ساتھ شامل رہتے ہیں۔ لیکن خالہ جان کو یہ نئے زمانے کے چونچلے ایک آنکھ نہ بھاتے۔

ایمان کی بات تو یہ ہے کہ مجھے اپنی پانچوں خالہ زاد بہنیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ گوری رنگت، ترشے ہوئے بال اور میک اپ کی تہیں ان کے حسن کو اور نکھار دیتی ہیں۔

سب سے بڑی فردوس آپا ہیں۔ ایم اے کا آخری سال ہے۔ ادبی ذوق نہیں بلکہ "ادبی عشق" رکھتی ہیں۔ جی ہاں کوئی اچھا شعر نظر سے گزر جائے تو گھنٹوں کھوئی رہتی ہیں۔ دوسرا نمبر مہہ جبیں آپا کا ہے جو بی ایس سی کر رہی ہیں اور بات بات میں سائنس پر لیکچر پلایا کرتی ہیں۔ جس پر ہم جیسے ادب کے رسیا ہمیشہ بور ہوتے ہیں۔ تیسری بہن نکہت آپا ہیں جنھوں نے بی اے کرنے کے بعد وکالت میں داخلہ لے لیا ہے۔ ان سے تو لوگ بات کرتے ڈرتے ہیں۔ اگر کوئی انکی مرضی کے خلاف بات کرتا ہے تو دھڑا دھڑ دس مثالیں دے کر جرح شروع کر دیتی ہیں کہ مجبوراً مخالفت کرنے والا "بجا ارشاد" کہہ کر جان کی امان پاتا ہے۔ چوتھے نمبر پہ آصفہ آپا ہیں جنھیں اپنے پرائے سب نے "اللہ میاں کی گائے" کا خطاب دے رکھا ہے۔ دن رات ناولیں پڑھتی ہیں یا اپنے باغ کے پھولوں کی صحت کے لئے فکرمند رہتی ہیں۔ اور سب سے آخر میں زیبا آپا، دنیا میں تشریف لائیں۔ چونکہ سب سے چھوٹی ہیں اس لئے سب سے زیادہ لاڈلی بھی ہیں اور "خودسری" میں بھی اپنی تمام بہنوں سے آگے ہیں۔ یہ دنیا سے چھوٹے بڑے کی تفریق مٹانے کی دن رات کوشاں نظر آتی ہیں لیکن خود اپنی تمام بہنوں سے زیادہ اچھے کپڑے پہنتی ہیں اور تفریح پر زیادہ سے زیادہ روپے خرچ کرتی ہیں۔ ایسا کرنے کے ان کا خیال ہے کہ وہ سرمایہ داروں کے دل کو ٹھیس پہنچا رہی ہیں۔

انکی خوبیاں تو دیکھ لیں آپ نے ــ لیکن اسوقت وہ "پانچوں سوار" جس دل ہلا دینے والی مصیبت میں گرفتار ہیں وہ دیکھ کر شاید آپ برداشت نہ کریں۔ ہماری خالہ جان کو بھی بس ایسی ہی اوندھی سیدھی باتیں سوجھتی ہیں کل شام کو ماسٹر صاحب کی لڑکی کو باورچی خانے میں جھٹ کھانا پکاتے کیا دیکھا۔ کہ جھٹ پانچوں بیٹیوں کے پیچھے پڑ گئیں۔ "اے ہاں ٹھیک تو کرتی ہیں ماسٹرنی بیکو کل دوپہر کا کھانا تم سب مل کر پکاؤ (لیوں سمجھئے دوپہر بھر قید بامشقت)

آخر کو پرائے گھر جانا ہے۔ میاں تمہارے اماں باوا کی طرح نہ دس نوکر رکھ سکا تو کیا فاقے پڑیں گے۔" زیبا آپا اس ظلم کے خلاف احتجاج کرنے ہی والی تھیں کہ خالہ جان بول پڑیں "خاموش" گویا قدم اٹھانے سے پہلے ہی گولی چل گئی ہے وقت کے قدم کوئی کب پکڑ سکا ہے۔ رات بیت گئی۔ صبح ہوئی اور آخر دل و دماغ کو ماؤف کر دینے والی دوپہر بھی آگئی۔

پانچوں لڑکیوں کو باورچی خانے (یا قید خانے کہہ لیجئے) بھیج کر خالہ جان دندناتی ہوئی آئیں اور کھانے کی فہرست بنا کر یہ جا وہ جا گویا ؎

"دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز"

فردوس آپا تو سدا کی جلد باز تھیں۔ باورچی خانے کا افتتاح کرتے ہی انھوں نے مہہ جبیں کو حکم دیا۔ تم چاول چڑھاؤ اور میں جب تک سبزی کاٹتی ہوں۔ جبیں آپا نے چاول دھونے کے بعد جو پانی ڈالا تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ مقدار میں پانی کتنا ہو ــ؟ آخر ایک ترکیب سمجھ میں آئی۔ جھٹ وہ اپنے کمرے سے پلاسٹک کی ایک پٹری لے آئیں۔ چاول کی پتیلی میں ڈبوتے ہوئے بولیں "بولئے آپ لوگ کتنے انچ پانی رکھوں ـ؟" نکہت آپا نے فوراً اپنی قیمتی رائے پیش کی "بھئی روٹی کھاؤ جلا کے چاول کھاؤ گلا کے، اس لئے ایک فٹ سے تو کسی طرح کم پانی مناسب نہیں"۔ سب نے اس "مناسب رائے" کی تائید کی۔ اور چاول کی پتیلی پہنچ گئی چولہے پر۔ چلئے ایک پرابلم تو حل ہوا۔

زیبا آپا نے روٹی پکانے کی مصیبت اپنے سر لی اور آٹا گوندھنا شروع کیا۔ "ہائیں اتنا پانی" جبیں آپا زور سے چلائیں۔ "ارے آٹا لیٹی بن جائے گا"۔ "بن جانے دو" زیبا آپا اپنے فیشن سے بنے گھونگھریالے بالوں کو پیچھے کی طرف جھٹکتے ہوئے بولیں۔ انسان کی طرح دنیا کے تمام اناج بھی برابر ہیں۔ اگر چاول کے حصے میں ایک فٹ پانی آیا تو گیہوں اپنے حق سے کیوں محروم رہے ـ؟ یہ بے انصافی میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ تفریق میں مٹا دونگی دنیا سے۔ زیبا یوں دھواں دھار تقریر کر رہی تھیں جیسے وہ کسی مزدوروں کے جلسے سے خطاب کر رہی ہوں...... اچانک جو نیچے نظر پڑی تو آٹے کا دریا نظر پڑا۔ نکہت آپا تو قانون داں تھیں ہی فوراً بگڑے معاملے کو سنبھال لیا۔ "کوئی حرج نہیں آٹا اور ملاؤ۔ اکثر باورچی خانے میں ایسے کیس ہو جاتے ہیں"۔ چلئے آٹا تو گوندھ گیا۔ اب روٹیاں بیلے گا کون؟ ہائے کتنا دشوار گزار ہے یہ کام۔ زیبا آپا کی لاکھ کوشش پر بھی نتیجہ صفر رہا۔ روٹیاں تو کسی طرح گول نہیں ہوئیں ہاں ہندوستان کا نقشہ ضرور بن گیا۔ "اب کیا کیا جائے؟" زیبا آپا نے اپنے سینٹ میں بسے رومال سے پسینہ خشک کرتے ہوئے پوچھا۔ "میری ڈکشنری میں لفظ ناممکن نہیں" آصفہ آپا نے کبھی یہ پڑھا ہوا نپولین کا قول دہرایا "روٹیوں کو ناشتے دان کے ڈھکن سے کاٹ دو خود بخود گول ہو جائے گی"۔ اس لاجواب "تجویز" پہ فردوس آپا سب بہنوں سے مخاطب ہوئی ہوئی بے اختیار

کہہ اٹھیں ؂

"اے اہل زمانہ قدر کرو کمیاب نہیں نایاب ہیں یہ"

آصفہ آپا کو اپنی تجویز پر ابھی چاروں طرف سے داد مل رہی تھی کہ ایک زوردار "سی" سنائی دی۔ یہ لیجئے نکہت آپا نے آلوؤں کی جگہ انگلی کاٹ لی۔ وہ جھٹ سے اپنا چھوٹا سا رومال انگلی کے گرد لپیٹ کر پھر چھری اٹھانے ہی جا رہی تھیں کہ مہہ جبیں آپا نے زخم سے لاپرواہی برتنے پر جو مرض اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ان پر لیکچر دینا شروع کیا اور کچھ ہی دیر بعد نکہت آپا کے نہیں نہیں کرنے کے باوجود انگلی دھو کر دوائی لگائی اور بینڈیج کرنے بیٹھ گئیں۔ چلئے انکی مرہم پٹی ہو چکی تو روٹی پکنے کی دوسری قسط شروع ہوئی ـــ "ہائے میرا ہاتھ" کہکر فردوس آپا بری طرح تڑپ گئیں۔ کیونکہ روٹی تو نیچے گر چکی تھی اور توے پر روٹی کی جگہ ہاتھ پڑ گیا تھا۔ جبیں آپا کی سائنس پھر کام آئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ جلدی جلدی "برنال" فردوس آپا کے مل رہی تھیں کہ قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی باورچی خانے کی طرف آرہا تھا ۔۔۔۔۔ یہ خالہ جان تھیں دھڑ دھڑا کے باورچی خانے میں داخل ہوئیں۔ اور سب سے پہلے چاول کی پتیلی کا ڈھکن اٹھایا تو چاولوں کی کھیر نظر آئی۔ روٹیاں دیکھیں تو وہ راکھ میں پتی ہوئی نظر آئیں۔ پھر ـــــ پھر تو جو قیامت آئی اسے نہ پوچھئے تو اچھا ـــ "منشور" کے سارے صفحے بھر دوں پھر بھی یہ دل ہلا دینے والی داستان ادھوری رہے گی۔ جی ہاں۔ سچ مچ ۔ ٭

بقیہ: سوشلزم

ٹریڈ یونینوں کا مطمع نظر ہونا چاہیئے۔

ہماری نسل کو ایک عظیم ورثہ ملا ہے۔ ہم کو اس ورثہ کا احترام کرنا چاہ
اور ٹریڈ یونین اور مزدور تحریک کے اتحاد کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرنا چاہ
غیر منظم مردوں، عورتوں اور جوانوں کو منظم کرنا چاہیئے۔ گروہ بندیوں پر قابو پاکر مختلف
ٹریڈ یونین تنظیموں کو مدغم کر کے کم سے کم اور مضبوط یونینیں بنانی چاہئیں۔ ترقی پسند
دار کارکنوں پر پابندی لگانے ان کو نکالنے اور مزدور دشمن منفی رجحانات کو ختم کرنا
بین الاقوامی ٹریڈ یونین تحریک میں تفرقہ ختم ہونا چاہیئے۔ کارکنوں میں اشتراکی ر
پھونکنی چاہیئے۔ اور لیڈر شپ میں اس جذبے کو جو تمام تحریکوں سے عظیم تحریک
پروان چڑھانا چاہیئے۔ یہ محنت کش طبقے کا اولین مقصد ہے اور اس کا مقصد
برطانیہ کے قیام کی جدوجہد ہے جسکے دنیا کے تمام ممالک سے پرامن تعلقات ہو



حسد نیکیوں کو اس طرح نگل جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو ______ حضرت محمدؐ

تین چیزیں ایسی ہیں جن سے نظام دہرا انہدام سے دوچار ہوتا ہے اور ان میں سے ایک صاحبِ علم کی لغزش اور غلطی ہے ______ حضرت عمرؓ

کسی مسئلے کو زیرِ بحث لاتے وقت مجرد تعریفوں کے بجائے امورِ واقعی پر اعتماد کرنا چاہیئے ______ ہاوزے تنگ

جمہوریہ کی تعریف اس طرح کر سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسی حکومت ہے جو اپنے تمام اختیارات راست یا بالواسطہ طور پر عوام کی اکثریت سے حاصل کرتی ہے ایک منظورِ نظر طبقے سے نہیں ______ جیمز میڈیسن

ایک رواداری فلاسفر کی ہے جس کے نزدیک سب مذاہب سچے ہیں، ایک رواداری مورخ کی ہے جسکے نزدیک سب مذاہب جھوٹے ہیں ______ گبن

ایک رواداری سیاسی مدبر کی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب اسکی مطلب براری کے لئے یکساں مفید ہیں ______ لینن

ایک اجتماعی کھیت سے ہی کسان اپنے افلاس سے نجات حاصل کر سکتا ہے ______ اینگلز

تاریخ کے مادی نظریہ کی رو سے حقیقی زندگی میں فیصلہ کن عنصر پیداوار اور اسکی تکرار ہے ______

آپکو چوروں سے اپنی حفاظت کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ زیادہ خطرناک نہیں۔ آپکو اپنی حفاظت ان لوگوں سے کرنی چاہیئے جو اپنے کو سچا شریف ظاہر کرتے اور حقیقت میں چور ہوتے ہیں ______ لوھون

جو حقیقت شروع میں آہستہ آہستہ چنگاری کی طرح سلگتی ہے وہ کچھ دنوں بعد تنظیم کی مدد سے طاقت پیدا کر کے ایک زبردست شعلہ بن جاتی ہے جس میں پرانی قدریں اس طرح جل جاتی ہیں کہ کام کی چیزیں تپ کر اور نکھر آتی ہیں اور اس راکھ کے ڈھیر سے نئی زندگی پیدا ہوتی ہے ______ احتشام حسین

______ سیوائل

عورتوں کی حسین آنکھوں میں ہمارے قوانین سے زیادہ طاقت ہے ______ حادیانی کھاوت

مقدمے بازی میں جیت گئے تو گویا جل گئے اور ہار گئے تو راکھ ہوئے ______ ابن سیمین

اگر تم اپنا بھلا چاہتے ہو تو دوسروں کی خدمت کرو ______ گوئٹے

جس شخص میں بلند حوصلگی نہیں وہ حرماں نصیب ہے ______ ٹی ایس ایلیٹ

جب مذہبی احساسات غائب ہوجاتے ہیں تو وہ الفاظ جنکی مدد سے انسان نے ان احساسات کے اظہار کی جدوجہد کی تھی، بے معنی ہوجاتے ہیں ______

سوشلزم کے بغیر ملک سے بدانتظامی، رشوت خوری، افسر شاہی، اقربا نوازی اور عوام کی لوٹ کھسوٹ کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ صرف سوشلزم ہی سے ہر قسم کی عوامی بہبودی حاصل کی جا سکتی ہے ______ مولانا بھاشانی

لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ جتنے زیادہ قوانین پاس ہوتے جائیں گے اتنے ہی کم جرائم سرزد ہوں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ قوانین کی تعداد میں اضافہ ہونے کے ساتھ ہی ساتھ جرائم کی تعداد میں بھی خوب اضافہ ہو رہا ہے بلکہ اکثر قوانین پر ہی مجرموں کے پیدا ہونے کی ذمہ داری ہے ______ کروپاٹکن

تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعتی جنگ، ظالم و مظلوم، آقا و غلام، سرمایہ دار و مزدور، زمیندار و کسان، سود خور و مقروض کے درمیان ہر زمانے اور ہر ملک میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی ہے۔ غالب جماعت کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ یہ غالب و مغلوب کی تمیز کسی نہ کسی پردے میں غائب و خفیہ رہے۔ لیکن جب کبھی بھی سوسائٹی کے موجودہ ڈھانچے کو بدلنے کی کوشش کی گئی تو اس وقت غالب جماعت اس ظاہری پردے کو پھاڑ دیتی ہے اور اپنی حقیقی شکل میں عوام کے سامنے آجاتی ہے ایسے وقت میں جمہوریت کا ڈھونگ عام قواعد و قوانین وغیرہ بالائے طاق دھر دیئے جاتے ہیں۔ یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ، جماعتی جنگ ایجی ٹیٹروں اور پیشہ ور بے چینی پھیلانے والوں کے پرچار کی وجہ سے چھڑ جاتی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ جماعتی جنگ ہماری سوسائٹی کا ایک حصہ ہے۔ کیونکہ سوسائٹی کی تقسیم ہی جماعتوں کے مطابق ہو چکی ہے ______ کارل مارکس

وہ شخص بھلا ستاروں پر کمند کیسے ڈال سکتا ہے جو اپنے ہی شجرۂ نسب کے دام میں پھنسا ہوا ہے ______ پلوٹارک

صبر مایوسی کی وہ قسم ہے جسے خوبی کا نام دے دیا گیا ہے ______ پیٹوسن

اگر میں آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتا تو انھیں لا کر مزدوروں کے ان تنگ و تاریک جھونپڑوں میں رکھ دیتا جن میں روشنی کا کوئی انتظام نہیں ______ قمر یورش

یاسمین اختر

شکست شب کو تمنا بنا سکو تو چلو
جہاں سے شب کا تسلط ہٹا سکو تو چلو

عمل کی جوت دلوں میں جگا سکو تو چلو
چراغِ اہل ہوس کو بجھا سکو تو چلو

سلوکِ لطف و کرم سے ہیں اہل دل محروم
جہاں کو نغمۂ الفت سنا سکو تو چلو

نصیب اہل جنوں ہے قفس کی تنہائی
چمن میں اپنا نشیمن بنا سکو تو چلو

رہ وفا میں لٹانی ہے زندگی اختر
فرازِ دار پہ خود کو سجا سکو تو چلو

واحد چغتائی

وہ جو بچھڑا تھا انتظار میں ہے
آئینہ بن کے رہ گزار میں ہے

دل ہی بس جانتا ہے تیرے بغیر
کیفیت جو بھری بہار میں ہے

وصل میں بھی نہ اس کے ہو شاید
لطف جو اس کے انتظار میں ہے

برق رفتار عمر پا بہ جنار
کتنی مجبور کوئے یار میں ہے

ہم اسے حسن کیوں کہیں واحد
حسن جو چشمِ ہوشیار میں ہے

فیروز نظر

یہ خموشی بار ہے اہل نظر کچھ تو کہو —!
تک رہے ہو کس لئے دیوار و در کچھ تو کہو

دل کو یہ تاریکیاں ڈستی رہیں گی کب تلک
ہمرہانِ وادیٔ فکر و نظر کچھ تو کہو —!

تم امینِ رنگ و بو تھے، تم نقیبِ وقت تھے
کس لئے چپ ہو ثنا خوانِ سحر کچھ تو کہو —!

یہ سکوتِ مرگ کیوں طاری ہے آخر کیا ہوا
ساکنانِ کوچۂ بے داد گر کچھ تو کہو —!

کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ تم پہ کیا گذری یہاں
سی لئے ہیں ہونٹ کیوں تم نے نظر کچھ تو کہو!

گیان
احمد جمیل

اک گوتم تو گیان کی کھوج میں،
چھوڑ کے سب کچھ،
سونا چاندی،
محل، خزانہ،
سندر بیوی،
پیڑ کے نیچے جا بیٹھا تھا،

میں بھی اپنے وقت کا گوتم،
اور مجھے یہ گیان ہوا ہے
بھوکا رہ کر
در در پھر کر
ہر خواہش پر قابو پا کر
جینا ہے تو کھوج کے لاؤ
سونا چاندی،
محل، خزانہ،
سندر بیوی ——،

حسن ظہیر

ہمارے عہد کی رودادِ خونچکاں ہوگا
جنوں کے ہاتھوں میں ایسا بھی اک نشاں ہوگا

اسی کی چاہ میں سب کچھ نثار کرتے چلیں
وہ ایک نام جو عنوانِ داستاں ہوگا

اٹھو کہ پھر درِ زنداں ہمیں بلاتا ہے
چلو کہ قافلۂ شوق پھر رواں —— ہوگا

ہمارے پاؤں کی زنجیر جب بھی چھنکے گی
لبوں پہ نغمۂ دار و رسن رواں ہوگا

رہِ طلب میں اکیلے سہی سرِ منزل
ہمارے ساتھ بہاروں کا کارواں ہوگا

ظہیر کہتے چلو اہلِ درد سمجھیں گے
وہ مدعا جو پسِ پردۂ بیاں ہوگا

شوکت خیال

بھگتوں کی سلطانی

نگری نگری گھومے ہیں اور بستی بستی چھانی ہے
روش روش پہ سناٹا ہے قدم قدم ویرانی ہے

دھنوالوں کے یوگی جوگی دھنوالوں کے گیانی دھیانی
دھیان دھرم کے بازاروں میں دولت سندر رانی ہے

لاکھوں شوالے لاکھوں مندر پل پل میں بنجاتے ہیں
جیون جیون خاک اڑی ہے بھگتوں کی سلطانی ہے

بڑھتے چڑھتے پاپ کے طوفاں ڈگر ڈگر تک پھیل گئے
دھرتی ماتا تیرا سینہ پاپ کی امر کہانی ہے

قدم قدم پہ اشور بھگتی تن کی پوجا دھن کی پوجا
ستّ نرائن جی کی جے ہو دنیا آنی جانی ہے

اک اک ایواں روپ نگر کا سج دھج کر آکاش بنا ہے
مرگھٹ بن گئے گھر دکھیوں کے کیسی کھلی من مانی ہے

شوکت بھیا چپہ چپہ جیون کا تاریک پڑا ہے
اندھیاروں سے لڑنا ہے اور راہ سحر دکھلانی ہے

صبا ہزاری باغوی

غزل

دو بھاگوں میں بٹا ہے بھگون آج ترا سنسار
ایک طرف ہیں بھوکے ننگے ایک طرف زردار

بھوک کے ہاتھوں بک جاتا ہے دیش، وطن، گھر بار
پیٹ کی بھٹی میں گلتا ہے سکہ بن کر پیار

مفلس کہہ کر زرداروں نے دیا جنھیں دھتکار!
پاک لہو سے ان کے ہے یہ دھرتی لالہ زار

اس نگری میں کیوں دُھراؤ مصر کا کاروبار
یہ نگری ہے پریم کی نگری نہیں کوئی بازار

کیسا یہ دستور ہے یارو کیسا یہ انصاف
کوئی ترسے اک کوڑی کو کسی کے حق بھنڈار

مدھبن کے ہر گل بوٹے سے ہم ہیں خوب پریچیت
کون صبا ہے تجھ سے بڑھ کر اس کا دعویدار

آخری خط

عبدالرزاق سیفی

پیاری پکھراج!

سلام عقیدت!!

آج شاید میرا یہ آخری خط ہو اس لئے تجھے اپنی ڈائری کے چند اوراق نقل کرکے بھیج رہی ہوں۔ چونکہ تو نے ڈائری کو ہمیشہ فضول چیز کہا تھا۔ اب تو اسی فضول چیز میں ہمارا المناک انجام دیکھ لے گی

"درختوں کے سبز پتے خزاں رسیدگی کا لباس اوڑھے دھرتی پر اپنی کھڑکھڑاہٹ سے عجیب سا سماں پیدا کئے ہوئے ہیں۔ سورج ڈھلنے والا ہے۔ اور پھر شام ہوگی۔ شام کے بعد رات . . . . . اور صبح کب ہو۔؟ کچھ خبر نہیں۔ چونکہ جو صدمہ اور غم اسوقت ہم اٹھائے ہوئے ہیں پھر شاید کبھی نہ اٹھا پائیں . . . کبھی نہ — میرے دونوں چھوٹے بھائی رو رو کر سو گئے ہیں۔ ماں اب تک کھانس رہی ہے فٹ پاتھ کے ارد گرد کی دھول تو کھانسی پر نمک پاشی کا کام کر رہی ہے۔ اب تو نہ داستاں ہے نہ آستاں۔!!

پکھراج تجھے یاد ہوگا کہ جب میرے آبا اللہ کو پیارے ہوئے تھے تو ہمارا سہارا صرف ہمارے بھائی جان تھے جنھوں نے گھر کی گرتی ہوئی حالت دیکھ کر اسکول کو خیر باد کہہ دیا تھا اور مقامی مل میں پچھتر روپے پر ملازم ہو گئے تھے۔ ہم لمحہ بھر کے لئے ابا کی جدائی بھول گئے تھے کہ یہ تنخواہ ہمارے لئے کافی تھی۔!

گھر کی تنگدستی دیکھ کر میں نے بھی اسکول چھوڑ دیا تھا۔ اب بھائی جان دن رات ڈیوٹیاں دینے لگے تھے۔ دن گزرتے رہے پت جھڑ کے موسم آتے رہے کلیاں پھول بنتی رہیں . . . . سرو کے درخت بلند ہوتے رہے۔ مزدور ملک و قوم کو فروغ دینے کے لئے مشینیں چلاتے رہے ملکی صنعتیں پروان چڑھتی رہیں۔

اس دور کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ مہنگائی نے بھی اپنے قدم زمین پر ٹیکنے شروع کر دیئے — دو سال کی سروس کے بعد پوری تنخواہ گھر کے خرچ کی نذر ہونے لگی۔ اس پر بھی ہم مطمئن تھے۔ کہ گزر اوقات تو ہو ہی رہی ہے ہاں البتہ دوا کیلئے ضرور تنگی محسوس ہوتی تھی اور کپڑے لتے کے لئے تو بونس کا سہارا تھا ہی اور اسی پر سب کچھ پورا ہو جایا کرتا تھا۔

کچھ دنوں سے ماں کو کھانسی کی شکایت بھی ہو گئی تھی۔ مل ڈسپنسری سے علاج کراتے رہے، دوائی لاتے رہے لیکن بے سود۔ اب پرائیوٹ علاج معالجے کیلئے اتنی گنجائش کہاں تھی اور یونہی یہ کھانسی بڑھتی رہی۔ سوچتی ہوں جس ڈسپنسری سے کھانسی کا علاج نہ ہو سکا۔ وہاں ایکسڈنٹ مزدور مریض کیونکر صحتیاب ہوگا بھائی جان نے بڑی کوششیں کرلیں کہ علاج ہو جائے۔ لیکن بقول ان کے کہ انھوں نے دوا دینے کا ٹھیکہ اٹھایا ہے ٹھیک ہونے کا نہیں۔ کچھ بھی تو نہ ہو سکا۔ ماں بھی تنگ آچکی تھی اناب شناب دوائیاں کھانے سے، آخر کیا کھاتی کب تک کھاتی۔ کہاں سے کھاتی اور کیوں کھاتی؟

پانچ سال کے عرصہ نے بھائی جان کی حالت بھی غیر کر دی تھی صحت دن بدن خراب — میں اکثر پورے گھر کی کفالت کرنے والے بھائی جان کے لئے دعائیں مانگتی رہتی۔ لیکن دعائیں —؟ ان کا اثر یہ ہوا کہ مہنگائی نے انگلی پکڑتے پکڑتے گلا پکڑ لیا تھا۔ نت نئے ٹیکس — اور اب تو کھانے پینے کی اشیاء پر بھی ٹیکس کا لیبل چپاں ہونے لگا تھا۔ اب بھائی جان قرضداروں کی فہرست میں شامل ہو گئے تھے — ماں کی طبیعت اب زیادہ خراب رہنے لگی۔ خود میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہم کیا کریں۔

پکھراج تجھے یاد ہوگا کہ بھائی جان کی نسبت عرصہ ہوا طے ہوئی تھی تب سے ہی میں ایک حسین سندر بھابی کے سپنے دیکھنے لگی تھی۔ میں اکثر پہروں سوچا کرتی۔ کہ میری بھی ایک بھابی ہوگی۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ کمنوٹ کے پھول کی طرح نکھری نکھری۔ گلاب کی مانند کھلی کھلی۔ ہاتھوں میں مہندی رچی ہوگی۔ مانگ میں سیندور ہوگا۔ چہرے پر کنول کی تازگی لبوں پر کلیوں کا تبسم۔ چہرے پر حیا کا آنچل۔ دوشیزگی کا لبادہ جب وہ سہاگن کے روپ میں ہمارے گھر میں قدم رکھے گی تو در و دیوار اس کے مقدر کی طرح چمک اٹھیں گے۔ اس کے حسین و شیریں قہقہے سننے کو میرے کان ترسنے لگے۔ کتنی حسین خواہش تھی۔ کتنا سندر سپنا۔ بالکل رنگین خواب۔!!

لیکن اسے کیا کہئے کہ بار بار لڑکی والوں کی جانب سے بلاوا آیا کہ بھئی شادی کرلو۔ اور ہر بار یہی پوچھتے کہ اپنا مکان بنوایا ہے یا نہیں کیا جواب دیتے؟ اور خاموش ہو ہو گئے — اور اس طرح میرا یہ خواب یہ سپنا شرمندہ تعبیر نہ ہوا تھا۔ غریبی کے دامن میں رسوائی کا پیوند لگتا تھا — اور بھیا کی نسبت لوٹ گئی۔ شادی کہاں سے کرتے؟ مکان کہاں سے بنواتے پیٹ کا پالنا مشکل ہو تو — شادی اور مکان کا مسئلہ کیونکر حل ہو؟

اس طرح بھائی جان کچھ زیادہ پریشان رہنے لگے۔ اکثر کوئی نہ کوئی بیمار پڑا ہی رہتا اب گھر کے ہر فرد کی حالت کمزور تھی۔ ماں کی کھانسی بڑھ گئی تھی۔ میں سارا دن گھر کے کاموں میں الجھی رہتی — پھنسی رہتی — گھری رہتی ایک رات تو غضب ہو گیا — وہ یہ کہ — کہ میں نے ایک خواب دیکھا — لیکن جلد ہی آنکھ کھل گئی۔ اور . . . . . !

اب بھائی جان پہلے سے زیادہ کمزور ہو گئے تھے۔ چہرے پر زردی چھاگئی تھی، آنکھوں میں پیلاہٹ آگئی تھی۔ اب ان کے چہرے پر تبسم آمیز مسکراہٹ کا تو نام، تک نہ تھا۔ جیسے خاموش موج۔ جس میں نہ کوئی طلاطم ہو نہ ارتعاش، نہ ہی بھنور — بس ایک ٹھہراؤ سا تھا۔ افسردگی گویا جسم و جان کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ میں یہ سب سمجھتے ہوئے بھی خاموش رہی۔ اور پھر کرتی بھی کیا؟

اور اب قرض خواہ اکثر میرے بھائی جان کو گھر پر سلام کرنے آنے لگے تھے — میں بہانا کر دیتی کہ بھائی جان ڈیوٹی پر ہیں۔ لیکن کب تک؟ قرضہ بڑھتا رہا۔ تن کا لباس ہفتوں کثیف رہنے لگا۔ غسل کے لئے اب صرف پانی پر اکتفا کیا جانے لگا۔ اور اب مہنگائی کے ساتھ ساتھ ماں نے بھی ضعیفی کو گلے لگا لیا تھا۔ بارہا اس نے دبی زبان میں عینک کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن وہ خواہش۔ وہ آرزو ہی کیا جو پوری ہو جائے

اور اب سات سال بیت جانے کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ بھائی جان بیمار ہیں۔ کمزور صحت، بے جان جسم۔ لیکن وہ کچھ نہ بولتے۔ اور اگر اصرار کریں بھی تو مصنوعی مسکراہٹ لاکر تسلی دے دیتے۔ میں دیکھتی کہ بھائی جان دن بھر ڈیوٹی دیتے اور رات بھر کھانستے ہیں۔ رات بھر ڈیوٹی دیتے دن بھر تڑپتے ہیں۔

اب یہ تنخواہ پندرہ دن بھر کے لئے مشکل ہو گئی تھی۔ قرضے کے پیوند سے ہمارے سب کے دامن داغدار تھے۔ میں نے تنگ آ کر کہہ بھی دیا ایک دن — چھوڑو بھائی جان بھاڑ میں جائے مل کی نوکری۔ کہیں اور چلیں "۔ وہ بولے، "پگلی کہاں چلیں؟ اول تو نوکری ملنا مشکل اور پھر مکان کا ملنا تو ناممکن۔ پھر ہم جیسے مفلس مزدور مکان کا کرایہ کہاں سے ادا کریں گے۔ یہ مل کا معمولی کوارٹر ہی بہتر ہے ہم جیسے مفلس و ناداروں کے لئے میری پیاری بہن "

اس دن ماں کا بخار بھی تیز تھا۔ بھائی جان ڈیوٹی سے آئے تو اس قدر کھانسے کہ انھیں خون کی قے ہو گئی، مامتا تڑپ اٹھی۔ مجبور مامتا تڑپ کر ہی رہ گئی۔ بہن کی مجبوریوں کا اندازہ بھائی کو بھی تھا۔ سب کچھ جانتے ہوئے ایک تلخ گھونٹ نگل کر خاموش ہو گئے ماں چارپائی سے لگ گئی چھوٹے بھائی اچھے خاصے کھیلنے کودنے کے قابل ہو گئے — اسکول کی فکر لگی — مگر — مسئلہ پیٹ کا ہی مشکل تھا۔ تو اسکول جانا کہاں سے ہوتا۔؟

پکھراج! دکھ درد اور پریشانی ہی مفلسی کی سب سے بڑی پونجی ہے۔ اور مجبوری ایک پیوند! جو انسانیت اور آدمیت کے دامن میں بحسن و خوبی منسلک ہو سکتا ہے۔ یہ پیوند صاحب ثروت طبقے کا نہیں۔ مفلس اور مزدور کا مقدر ہے اور اس طرح اس پونجی کی حفاظت ہم بخوبی کر رہے ہیں۔ چاند نے کئی رخ بدلے، سورج نے کئی موسم دکھائے ستارے جگہ بدلتے رہے۔ مل کی چمنیوں کا دھواں فضا میں تحلیل ہو کر بادلوں سے گلے ملتا رہا۔ بائلر کی سیٹی ہر رات سکوت توڑتی رہی۔ دامنوں میں پیوند کا اضافہ ہوتا رہا۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بھائی فاقوں کی تاب لاتے رہے — خشک گیسو بکھرنے لگے۔ میں خود کو بھول گئی۔ ٹیکس لگتے رہے۔ گرانی پر شباب آتا رہا قرضہ بڑھتا رہا۔ کھانسی اور زیادہ ہو گئی۔ اور نہ بڑھی تو صرف تنخواہ —!!

بھائی جان کی سروس کو دس سال پورے ہونے کو تھے۔ دس سال کے بعد تنخواہ میں تین روپے کی ترقی ہوئی۔ یہ تھا حکومت کا کرم۔ یہ تھی سرمایہ دار کی مہربانی تین روپے کی ترقی گویا تیس تیس سالہ انسان کو اس کا انعام ایک معمولی سے کھلونے سے دیا جائے۔ سوچتی ہوں یہ ترقی ہے یا پستی —؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

اب تو ہی بتا کہ آخر کیا ہے یہ؟

وقت پر لگا کر اڑا۔

اس دن ماں بھی کھانس رہی تھی۔ چھوٹے بھائی گلی میں کھیل رہے تھے میں پرانی قمیص میں پیوند لگا رہی تھی۔ کہ دور کوارٹروں کے باہر کچھ شور سنائی دیا۔ بھائی جان ڈیوٹی پر تھے۔ شور پھر کانوں میں گونجا۔ جواب قدرے قریب تھا۔ میں غیر ارادی طور پر دروازے کی طرف لپکی۔ چند مزدور ایک چارپائی پر کسی کو اٹھائے قریب آ رہے تھے۔ میں دیکھنے لگی۔ وہ قریب آ گئے — میری جانب۔ اور جب قریب آ کر چارپائی رکھی تو میری چیخ نکل گئی — پھر مجھے معلوم نہیں کیا ہوا — لیکن جب سنبھلی تو بھائی جان کی جگہ انکی لاش تھی —!!!

وہی زرد چہرہ، نڈھال جسم، کمزور صحت۔ میرے اشک منجمد ہو کر رہ گئے ذہن ماؤف ہو گیا سکتہ کا عالم تھا — پکھراج! جانتی ہے کیوں؟ بھائی جان کو روئی کا کام کرتے کرتے ایک عرصہ بیت گیا تھا۔ اور اسی کام میں ان کو ٹی بی ہو گئی تھی۔ ٹی بی۔ جسکا انھوں نے پتہ کبھی نہ دیا۔

پکھراج بھائی جان کی دس سال کی سروس تھی نا۔ مل مزدور تھے۔ اس لئے کفن کے لئے چندہ کیا گیا تجہیز و تکفین ہوئی اور ہم بے یار و مددگار ہو گئے — ماں نڈھال ہو گئی — پھر —؟ پھر جانتی ہو کیا ہوا۔؟ صرف ایک ہفتہ میں ہم سے کوارٹر خالی کرا لیا گیا۔ بغیر کسی امداد کے بغیر کسی نوٹس کے۔ جب ملازم نہ رہا۔ تو کوارٹر کیسا۔؟ بھائی جان کی موت کی ذمہ دار مل تھی۔ اسے ٹی بی مل سے ہوئی تھی۔ حالت مل میں غیر ہوئی تھی اور موت مل ڈسپنسری میں۔ جس کا انھیں یا ہمیں کوئی معاوضہ نہیں دیا گیا۔ مل کی رپورٹ میں وہ اپنی موت آپ مرے تھے ان کا کوئی دوش نہ تھا۔ اسی وجہ سے کوئی معاوضہ، کوئی گریجویٹی، کوئی امداد نہ دی گئی۔

سوچتی ہوں کہ کیسے مورد الزام ٹھہراؤں مل منتظمین کو۔ کہ جو میرے بھائی جا[ن] کی ہلاکت کے ذمہ دار تھے۔ یا مہنگائی کو — جسکے سبب ہمارے مصائب کی ا[بتدا] ہوئی۔ یا حکومت کو جس نے آج تک مزدوروں کے لئے کچھ نہیں کیا — لیکن کچھ فیص[لہ] نہ کر سکی۔ میں کروں بھی تو کیا کروں؟ میں کیا جانوں؟

رات سر پہ ہے اور اس وقت سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر جہاں خزا[ں] کے سرد پتے اپنی کھڑکھڑاہٹ سے عجیب سماں پیدا کئے ہوئے ہیں۔ آنے وال[ے] وقت کے متعلق سوچ رہی ہوں۔

اب کیا ہو گا؟ رات سر پہ ہے۔

اب کیا ہو گا؟ اے پکھراج کیا ہو گا۔؟

کچھ فیصلہ نہ کر سکی تو تجھے لکھ دیا تاکہ تو ہی فیصلہ کر دے۔ اور جب کو[ئی] جواب مل جائے تو مجھے لکھ دینا۔ دیکھ ذرا جلدی کرنا زیادہ دیر نہ لگانا۔ نہ جان[ے] آج کل میرے کانوں میں ایک عجیب سی آواز، گمبھیر سی چیخ گونجتی رہتی ہے جیسے میں ہی چیخ رہی ہوں اور جیسے میں ہی سن رہی ہوں۔ یہ آواز دم گھونٹتی رہت[ی] ہے۔ کلیجہ چباتی رہتی ہے۔ اور کوئی اس آواز کو نہیں سنتا۔ اور کوئی اس درد کو نہیں جانتا — پیاری پکھراج میں کیا کروں۔ مجھے میرے اشکوں کا بہاؤ کس طرف لیجائے۔ تجھے خبر نہیں؟؟ کچھ خبر نہیں؟؟

عارف عباسی

انسان اور دیوتا

یہ مرا گاؤں ہے۔
گاؤں،
محنت کشوں کا وطن،
ایسی دنیا جہاں پر خوشی ہر طرف بادلوں کی طرح ایک بہروپ اوڑھے
ہواؤں پہ کرتی ہوئی رقص
اپنے پروں سے کسانوں پہ سایہ فگن ہے
—— دہقان خوش ہیں!
انھیں کچھ پتہ ہی نہیں ہے کہ شہروں میں کیا ہو رہا ہے۔
انھیں کیا پتہ لوگ اک دوسرے کو درندوں کی مانند
شب خوں، بموں، راکٹوں سے لہو اور آتش کے اسرار سمجھا رہے ہیں!
کون ان سے کہے؟
تمہارے قبیلے کے کچھ لوگ راہیں بھٹک کر کہاں سے کہاں آ گئے ہیں۔
کتنے قبیلے
لہو اور آتش کے اوتار کی بھینٹ ہو کر
تمہارے قبیلے کے ان دیوتاؤں
تمہارے خداؤں کی تشنہ لبی میں اضافہ کیے جا رہے ہیں!!
ڈرو!
اپنے انجام سے،
اور قبیلے سے بھٹکے ہوئے ان درندوں، کمینوں سے
جو اپنے ہاتھوں سے اپنے قبیلے کو، اپنی ہی دنیا کو برباد کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں
انھیں،
اس سے پہلے کہ یہ اور زیادہ تباہی کا باعث بنیں
کسی ہیروشیما، کسی ناگاساکی کے منظر کو دہرائیں
اور اس سے پہلے کہ پھر کوئی بستی
تمہارا قبیلہ لہو اور آتش کے ان قائدوں
دیوتاؤں کی آماجگاہ بن کے رہ جائے
اور اس سے پہلے کہ دنیا خلا بن کے رہ جائے
ان دیوتاؤں
قبیلے سے بھٹکے ہوئے ان درندوں
شیاطین کو ختم کر دو —— !!!

شاہد الوری

غیر ممکن ہے گلستاں ہو بیاباں کے قریب
آپ کا دست کرم ہو مرے داماں کے قریب

بڑھ کے آنکھوں پہ، محبت سے لیا خاروں نے
یں جو با دیدۂ نم پہنچا بیاباں کے قریب

دل میں گھر کرتی چلی جاتی ہے الفت جتنی
ہوتا جاتا ہے جنوں اتنا گریباں کے قریب

اب خدا چاہے تو کچھ دار و رسن دور نہیں
کھینچ لائی ہے محبت مجھے زنداں کے قریب

آشیانے پہ گری آ کے تو معلوم ہوا
برق کا گھر بھی تھا دیوار گلستاں کے قریب

وہ بھی دن تھے کہ رگ جاں سے قضا ڈرتی تھی
یہ بھی دن ہیں کہ ہے ہر وقت رگ جاں کے قریب

رنگ و بوئے گل و غنچہ کا نشہ جب اترا
خار ہی خار تھے شاہد مرے داماں کے قریب

کراچی میں مزدور کارکنوں کی حالیہ گرفتاریوں کی شدید مذمت

حالات کو بگاڑنے کی تمام تر ذمّہ داری مل مالکان پر ہے۔

کراچی (نمائندہ منشور) پانچ ٹریڈ یونین کارکنوں ۔ نبی احمد ، واحد بشیر، محمد عالم ملک ضیاء الحق اور محمد یامین نے حسب ذیل بیان قومی اخبارات کے نام جاری کیا ۔

ہمیں سخت افسوس ہے کہ مناسب تحقیقات کے بغیر انتظامیہ نے مزدور کارکنوں کے خلاف نقص امن کے اندیشے کے تحت کاروائی کی ۔ مالکان و منتظمین نے جان بوجھ کر ایسے حالات پیدا کئے اور اپنی ذمہ داری دوسروں پر منتقل کرنے میں کامیابی حاصل کرلی ۔ مالکان و منتظمین نے ہمیشہ سیاسی اور معاشی حالات سے فائدہ اٹھا کر ، مزدور کارکنوں اور انجمنوں کے خلاف انتقامی کاروائیاں کیں ۔ ہماری رائے میں مزدوروں میں موجودہ بے چینی کی حسب ذیل وجوہات ہیں ۔

۱:۔ مالکان اور منتظمین کا مزدور دشمن رویہ ۔

۲:۔ مزدوروں کے مطالبات کو بات چیت کے ذریعہ تسلیم نہ کرنے کا رجحان ۔

۳:۔ صنعتی تنازعات کا کئی کئی سال تک فیصلہ نہ ہونا ۔

۴:۔ تالہ بندی کے خلاف کوئی کاروائی نہ ہونا ۔

۵:۔ سلک ملوں میں تین شفٹوں کی بجائے ایک شفٹ اور آٹھ گھنٹے اور بارہ گھنٹے کی بجائے چار گھنٹے روزانہ کام سے آمدنی میں ناقابل برداشت کمی ۔

۶:۔ کمپنی یونین کو مزدوروں پر زبردستی تھوپنے اور کرائے کے لوگوں سے مزدور انجمنوں میں انتشار پھیلانے کا رجحان ۔

ان حالات کے باوجود کراچی کے مزدوروں نے کوئی بدنظمی پیدا نہیں کی لیکن پھر بھی مالکان ان کے خلاف کاروائیاں کروانے میں حسب سابق کامیاب ہوگئے ۔

ہم انتظامیہ اور حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ پرامن مزدور کارکنوں کے خلاف مقدمات واپس لئے جائیں اور انھیں فوراً رہا کیا جائے ۔ ہم اس بات کی بھی درخواست کرتے ہیں کہ مزدور مسائل حل کرنے کے لئے مناسب کاروائیاں عمل میں لائی جائیں اور ایسے مالکان کے خلاف سخت کاروائی کی جائے جو جان بوجھ کر بدامنی پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں ۔

اور حقیقت یہ ہے کہ حالات کو بگاڑنے کی تمام تر ذمہ داری مل مالکان پر ہے ۔

اساتذہ کے مظاہرے کا آغاز !

کالجوں میں مظالم کے خلاف احتجاج

کراچی ۱۰ر جولائی (نمائندہ منشور) غیر سرکاری تعلیمی اداروں کے تقریباً چار سو سے زائد اساتذہ نے پرائیوٹ تعلیمی اداروں میں اساتذہ کے خلاف انتقامی کاروائی کے خلاف احتجاج کے طور پر بازوؤں پر کالے بلّے باندھے اور، خاموش مظاہرہ کیا ۔ اگرچہ گرمیوں کی تعطیلات کی وجہ سے کالج بند تھے ۔ لیکن جن مرکزوں پر ثانوی تعلیمی پرچوں کی جانچ ہو رہی تھی ۔ وہاں تقریباً ۴ سو اساتذہ نے بازوؤں پر ماتمی بلّے باندھ کر مظاہرہ کیا ۔ نیشنل کالج ، ایس ایم کالج ، اور پی ای سی ایچ سوسائٹی کالجوں پر مظاہرے ہوئے ۔ مغربی پاکستان ٹیچرز ایسوسی ایشن کے صدر مسٹر حسنین کاظمی نے الزام لگایا ہے کہ مقامی پرائیوٹ اسکولوں اور کالجوں میں متعدد اساتذہ کی ملازمتیں گرمیوں کی تعطیلات میں محض اس لئے ختم کی گئیں کہ ان کی تنخواہوں کا روپیہ بچایا جا سکے ۔ اس طرح ملازمت کی شرائط کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اساتذہ کا خاموش مظاہرہ انھیں دھاندلیوں کے خلاف تھا ۔

ولیکا ٹیکسٹائل مل میں ہڑتال یا تالہ بندی ؟

کراچی (نمائندہ منشور) ولیکا ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ میں ۱۹ر جولائی ۶۵ء سے ہڑتال ہوگئی ہے ۔ مزدوروں کا کہنا ہے کہ انھوں نے اپنے پانچ سو ساتھیوں کی غیر قانونی تالہ بندی کے خلاف ہڑتال کی ہے ۔ جنھیں کام پر واپس لینے کا وعدہ منتظمین نے کیا تھا ۔

منتظمین نے صنعتی عدالت میں درخواست دی ہے کہ مزدوروں نے غیر قانونی ہڑتال کی ہے ۔ لہٰذا انھیں ہڑتال ختم کرنے کا حکم دیا جائے ۔ کاپی پریس میں جانے تک ہڑتال جاری ہے ۔

مبارک ساغر کی مالی امداد کی جائے

مرکزی و صوبائی حکومتوں سے اپیل

کراچی ۴ر جولائی (نمائندہ منشور) کراچی یونین آف جرنلسٹ کے سیکریٹری جنرل مسٹر منہاج برنا نے آج ایک بیان میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں سے اپیل کی ہے کہ ملک کے ایک پرانے صحافی اور سوشلسٹ لیڈر مسٹر مبارک ساغر کی مالی امداد کریں وہ آجکل شدید علیل ہیں اور سول ہسپتال میں زیر علاج ہیں ۔ مسٹر برنا نے کہا کہ مسٹر مبارک ساغر نے برطانوی دورِ حکومت میں کئی دفعہ جیل کی سزا بھگتی ہے اور قیام پاکستان کی جدوجہد میں انھوں نے بڑا حصّہ لیا ہے ۔ انھیں ذیابیطس اور فالج ہے ۔ اس کے علاوہ عارضۂ قلب میں بھی مبتلا ہیں اور اب پچاس سال کی عمر میں بالکل معذور ہو چکے ہیں ۔ ایسی حالت میں بھی وہ اپنے پورے خاندان کے تنہا کفیل ہیں اور آجکل انکی طویل علالت کی وجہ سے ان کا خاندان شدید مالی پریشانیوں سے دوچار ہے ۔

پاکستان سکوریٹی پریس ایمپلائز یونین کے انتخابات

کراچی ۱۶ر جولائی (نمائندہ منشور) پاکستان سیکوریٹی پریس ایمپلائز یونین کی جنرل باڈی میٹنگ نے یونین کا سالانہ جلسہ عام ۲۱ر جولائی کو منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس میں دستور کے مطابق سالانہ رپورٹ پیش کی جائیگی اور سال رواں کیلئے یونین کے عہدیداروں اور مجلس انتظامیہ کے انتخابات عمل میں آئیں گے جنرل باڈی نے ۱۰ افراد پر مشتمل ایک الیکشن کمیٹی بھی تشکیل دی ۔ جو اپنی سرکردگی میں آزادانہ انتخابات کرائے گی ۔ کمیٹی کا چیرمین جناب عبدالمجید کو منتخب کیا گیا ۔

ایشیا، افریقہ کے مزدوروں کی علاقائی فیڈریشن قائم کی جائے

(شمیم واسطی صاحب صدر ویسٹ پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز کی پریس کانفرنس)

کراچی (نمائندہ منشور) ویسٹ پاکستان فیڈریشن آف یونینز کے نئے صدر جناب شمیم واسطی صاحب نے ۱۲ر جون کو ہوٹل جبیس میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ایشیا اور افریقہ کے مزدوروں کے مسائل امریکہ اور یورپ کے مزدوروں کے مسائل سے مختلف ہیں ان مسائل کو جلد اور موثر طریقے پر حل کرنے کیلئے مناسب ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے مزدوروں کا ایک مضبوط وفاق قائم کیا جائے۔

صدر صاحب نے کہا کہ جماعت سازی اور حق ہڑتال پر پابندیوں کی وجہ سے مزدوروں کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ سرمایہ دار حالات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے نہ صرف یہ کہ مزدوروں کو مناسب اجرت، خراب حالاتِ کار کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات، انتقامی طور پر غیر انسانی برتاؤ اختیار کر رہے ہیں — انھوں نے کہا کہ فیڈریشن، اجتماعی سودا کاری اور انجمن سازی کے حق کی بحالی کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھے گی تاکہ مزدوروں کے حالات کار اور معیار زندگی بہتر ہو۔ دیرپا صنعتی امن قائم ہو سکے جو عام خوشحالی کی ضمانت بنے گا۔

شمیم صاحب نے کہا کہ فیڈریشن اپنے طور پر عالمی امن کے قیام میں مدد دینے کی کوشش کرے گی اور اس مقصد کے لئے دوسرے اداروں سے بھی عملی تعاون کرے گی۔

شمیم واسطی صاحب نے حیدرآباد کی ڈیلی گیٹس کانفرنس منعقدہ ۶ر۷ر جون ۶۵ کے الیکشن کی تفصیل کے علاوہ خاص خاص قراردادوں پر بھی روشنی ڈالی انھوں نے کہا کہ گزشتہ کئی سال سے یہ فیڈریشن بغیر کسی بیرونی امداد کے اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ اب ہم کسی بیرونی امداد کے بجائے اپنے وسائل سے اپنی تحریک کو منظم کریں گے۔

حق ہڑتال بحال کیا جائے

مزدوروں پر ظلم و ستم ختم کیا جائے، دفعہ ۱۴۴ اٹھائی جائے

فیڈریشن آف بنک ایمپلائز کا مطالبہ

کراچی ۲۶ر جون (اسٹاف رپورٹر) فیڈریشن آف بنک ایمپلائز کی مرکزی کمیٹی نے آج اپنے اجلاس میں متعدد قراردادوں کے ذریعہ مطالبہ کیا کہ حق ہڑتال بحال کیا جائے، صنعتی تنازعات کے جلد فیصلے کے لئے مصالحتی ادارہ کی کارکردگی بہتر بنائی جائے اور صنعتی عدالتوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ غیر لائسنس یافتہ   کی مالکان کی جانب سے بیردی پر پابندی لگائی جائے۔ مزدور انجمنوں کی تشکیل اور اجتماعی سودا کاری پر سے رکاوٹیں دور کی جائیں اور ٹریڈ یونینز ایکٹ یا صنعتی تنازعات کا قانون، دوکانداروں۔ اور اداروں کے قوانین، صنعتی و تجارتی اداروں کے اسٹینڈنگ آرڈرس اور دیگر فرسودہ استحصال مزدور دشمن قوانین کو بہتر بنایا جائے۔

فیڈریشن نے سرمایہ داروں کی شہ پر پولس اور حکام کی جانب سے مزدوروں اور مزدور کارکنوں پر کئے جانے والے حالیہ ظلم و ستم، گرفتاریوں اور مزدوروں کی جائز اور پرامن سرگرمیوں میں مداخلت کی پرزور مذمت کی اور شہر سے دفعہ ۱۴۴ اٹھائے کا مطالبہ کیا۔ فیڈریشن نے نیو جوبلی انشورنس کمپنی اور دیگر صنعتوں کے محنت کشوں کو اپنی مکمل حمایت کا یقین دلاتے ہوئے مزدور طبقہ سے اپیل کی کہ وہ سرمایہ داروں اور پولس کی سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لئے متحد و منظم ہو کر اپنے حقوق و مطالبات کی حفاظت کریں۔

ٹریڈ یونین کارکنوں کی گرفتاری کی مذمت، رہائی کا مطالبہ

یکم جولائی کو ویسٹ پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز کی کراچی کمیٹی کا ایک ہنگامی اجلاس زیر صدارت جناب ایم اے خطیب منعقد ہوا جس میں گرفتاریوں سے پیدا شدہ صورت حال پر غور کیا گیا۔ بغیر کسی معقول وجہ کے ٹریڈ یونین کارکنوں کی فوجداری دفعات کے تحت گرفتاری ناعاقبت اندیشانہ اقدام ہے۔ قرارداد میں مزدوروں میں پیدا شدہ بے چینی کی وجوہات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اسکی ذمہ داری ان مالکان

پر ہے جو مختلف بہانوں سے مزدوروں پر تشدد کر رہے ہیں اور ان کے خلاف انتقامی کاروائیاں کر رہے ہیں۔ انکی اجرتیں گھٹا رہے ہیں اور اوقات کار میں تخفیف کر کے پیداوار گھٹا رہے ہیں۔ قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ گرفتار شدہ مزدور کارکنوں کو رہا کیا جائے۔ ان کے خلاف مقدمات واپس لئے جائیں اور بدامنی پھیلانے والے مل مالکان کے خلاف کاروائی کیجائے۔

کراچی کمیٹی کی تنظیم نو کا فیصلہ، آرگنائزنگ کمیٹی کا انتخاب

گرفتار شدہ مزدور کارکنوں کو قانونی اور مالی امداد دینے کا فیصلہ

مغربی پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز کی کراچی کمیٹی کی ملحقہ یونینوں کا ایک اجلاس بتاریخ ۱۳ر جولائی بوقت پانچ بجے شام ڈینسو ہال میں منعقد ہوا۔ اجلاس کی صدارت ایم اے رشید نے کی اور اس میں ملحقہ یونینوں کے دو سو کے قریب نمائندوں نے شرکت کی۔

ایجنڈا حسب ذیل تھا۔

۱:- کراچی کمیٹی کے انتخابات کے لئے تاریخ کا تعین۔

۲:- موجودہ صورت حال اور خاص طور پر ٹریڈ یونین کارکنوں کی اندیشۂ نقص امن کے تحت گرفتاری پر غور۔

جلسے کی کاروائی کا آغاز کراچی کمیٹی کے قائم مقام جنرل سیکریٹری جناب نبی احمد نے کیا۔ انھوں نے ایجنڈے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ چند قانونی الجھنوں کی وجہ سے کراچی کمیٹی کافی عرصہ سے ایک تنظیم کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام نہیں دے سکتی تھی اس عرصہ میں ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ کراچی کمیٹی کی تنظیم نو بے حد ضروری ہو گئی ہے۔ ایجنڈے کی دوسری شق پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے حالات کا مختصراً جائزہ لیتے ہوئے کہا حکومت کے مختلف اداروں نے صحتمند مزدور تحریک کے کارکنوں کے ساتھ جو رویّہ اختیار کر رکھا ہے اس سے بہتر یہ ہے کہ ایک آرڈیننس کے ذریعہ یہ بات واضح کر دی جائے کہ فلاں فلاں لوگ یونین میں کام کر سکتے ہیں اور فلاں فلاں لوگوں پر مزدوروں کے دروازے بند ہیں۔

اس کے بعد ایئر ویز ایمپلائز یونین پی آئی اے برانچ کے صدر جناب طفیل عباس صاحب نے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پچھلے سترہ سال سے میں مزدور تحریک میں حصہ لے رہا ہوں اور اس عرصہ میں   میں نے یہی دیکھا

ہے کہ جب بھی مزدور متحد ہونے لگتے ہیں اور اپنے حالات بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو دفعہ ۱۴۴ سے لے کر سیفٹی ایکٹ اور سیکوریٹی ایکٹ تک جبریہ قانون ان کے خلاف استعمال ہوتا ہے اور باہر رہ جانے والے لوگ اسی طرح میٹنگیں کرتے اور قرار دادیں پاس کرتے ہیں۔ میرے خیال میں جب تک مزدور دوستوں اور دشمنوں میں تمیز نہیں کریں گے یہی حالات رہیں گے اور مزدور تحریک اپنے چھوٹے چھوٹے جھگڑوں میں پھنسی رہے گی۔ آج کے حالات میں مزدور طبقے پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ انھیں اپنے روزمرّہ کے مسائل کے علاوہ ان بنیادی حالات پر بھی غور کرنا ہوگا جنھیں تبدیل کئے بغیر اجرتوں میں اضافے بونس اور دوسری تمام سہولتیں بے معنی ہیں۔ کیونکہ سرمایہ دار اگر ایک ہاتھ سے ایک پائی دیتا ہے تو دوسرے ہاتھ سے دو پائی چھین لیتا ہے۔

اس کے بعد ایجنڈے پر تبادلۂ خیال ہوا اور طے پایا کہ اگست کے آخر تک بہرصورت کراچی کمیٹی کے الیکشن کروا دیئے جائیں۔ اس مقصد کے لئے پانچ افراد پر مشتمل ایک آرگنائزنگ کمیٹی تشکیل دی گئی جو تمام ملحقہ یونینوں سے ضروری معلومات کے بعد انتخابات کی تاریخ کا اعلان کرے۔ اس کے تمام انتظامات کرے گی کمیٹی ان حضرات پر مشتمل ہے۔ نبی احمد - ایم اے رشید - صغیر احمد - ایس ایس ایم ظفر اور ریاض صاحب۔

واحد بشیر کی تجویز پر اجلاس نے فیصلہ کیا کہ گرفتار شدگان کی رہائی کے لئے، انتظامیہ کے عہدیداران سے ملاقات کیجائے اور ملاقات نہ ہونے یا رہائی نہ ہونے کی صورت میں ایک پمفلٹ شائع کیا جائے جس کے ذریعہ انتظامیہ۔ محکمۂ محنت اور مل مالکان کی کارگزاریوں کی روئداد عام مزدوروں تک پہنچائی جائیں۔

مزدوروں کو خوفزدہ کرنے کی مذموم کوششیں

محکمۂ محنت اور انتظامیہ کا مزدور دشمن رویّہ!

چاچا علی جان۔ ابنِ ایوّب کی گرفتاری

کراچی (نمائندہ منشور) باخبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ۲۵ رجون ۶۵ء کو کراچی کے نئے کمشنر صاحب کی زیر صدارت کراچی کی انتظامیہ سے متعلق افسروں کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں محکمہ محنت کے افسران نے بھی شرکت کی۔ اور باتوں کے علاوہ اس میٹنگ میں مزدوروں میں بڑھتی ہوئی بے چینی پر غور کیا گیا اور محکمہ محنت کے افسران کی تجویز پر نہ صرف یہ کہ شہر میں ایک ماہ کے لئے دفعہ ۱۴۴ نافذ کردی گئی بلکہ مخلص اور نڈر ٹریڈ یونین لیڈروں کی گرفتاریاں بھی عمل میں لائی گئیں۔ گرفتار ہونے والے ٹریڈ یونین لیڈروں میں چاچا علی جان، ابن ایوب صاحب، سرداری صاحب، فضل رحیم صاحب بھی شامل تھے

چاچا علی جان جن کا تعلق منگھوپیر کے صنعتی علاقے سے ہے ابن ایوب صاحب کا تعلق لانڈھی کے صنعتی علاقے سے ہے اور دونوں رہنماؤں کا جن ملوں اور فیکٹریوں کی یونینوں سے تعلق ہے ان میں سے کسی ایک جگہ بھی کوئی گڑبڑ نہیں تھی۔ فضل رحیم صاحب کا تعلق بروک بانڈ ٹی کمپنی سے ہے جہاں کسی قسم کا کوئی تنازعہ موجود نہیں تھا۔ سرداری صاحب کا احمد عبدالغنی ٹیکسٹائل ملز سے تھا اور کافی عرصہ پہلے وہ اپنی ٹریڈ یونین سرگرمیوں کی بنا پر وہ ملازمت سے نکال دیئے گئے تھے۔ وہ آج کل بے روزگاری کا شکار ہیں۔ احمد عبدالغنی ملز میں بھی کوئی گڑبڑ نہیں تھی۔

چاچا علی جان کو ولایت آباد منگھوپیر روڈ کے ٹریڈ یونین آفس سے گرفتار کیا گیا ابن ایوب صاحب کو جبکہ وہ کیفے آرام لانڈھی میں بیٹھے ہوئے تھے ایک سپاہی نے یہ اطلاع دی کہ تھانیدار صاحب ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ تھانہ پہنچے اس کے بعد عدالت ہی میں انکی خبر مل سکی اس دوران میں ٹریڈ یونین کے دوسرے کارکنوں کو انکے حالات سے بے خبر رکھنے کی کوشش کی گئی اور تھانہ پر بھی ان لوگوں کو کسی سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی — نہ کوئی پیغام بھیجنے کی اجازت دی گئی۔

ان کے علاوہ ولیکا ٹیکسٹائل ملز اور رشید ٹیکسٹائل ملز کے چند کارکنوں کو بھی گرفتار کیا گیا۔ کیونکہ ولیکا کے مزدور احتجاج کر رہے تھے اور رشید ٹیکسٹائل ملز کے مزدوروں نے ہڑتال کر رکھی تھی۔

چند ٹریڈ یونین کے کارکنوں نے نمائندہ منشور سے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ انتظامیہ کے چند افسران کی سفارش پر محکمہ محنت کے منظور نظر مزدور دشمن عناصر سے تعلق رکھنے والے تمام گرفتار شدگان کو رہا کر دیا گیا۔ حالانکہ گڑبڑ انھیں ملوں میں تھی جن سے ان کا تعلق تھا۔ فضل رحیم اور سرداری کو ایک ہفتہ بعد رہا کیا گیا لیکن چاچا علی جان اور ابن ایوب کو تقریباً ایک ماہ گزر جانے کے بعد بھی رہا نہیں کیا گیا ہے۔ ان کارکنوں نے نمائندہ منشور کو بتایا کہ ان دو مزدوروں کے رہنماؤں کے ساتھ یہ امتیازی سلوک کوئی تنہا واقعہ نہیں ہے بلکہ پورے مغربی پاکستان میں محکمہ محنت کے اعلیٰ ترین عہدے داران دیانت دار اور مقبول ترین ٹریڈ یونین کارکنوں کے ساتھ یہی امتیازی سلوک کر رہے ہیں اور اپنی سازشوں سے انتظامیہ کو غیر ضروری اور غیر معقول اقدامات پر آمادہ کر رہے ہیں۔ رجسٹریشن وغیرہ کے سلسلے میں یہ امتیازی سلوک اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ رجسٹرار ٹریڈ یونین کو رجسٹریشن کی درخواست دیتے ہوئے ایک ایک سال گزر جاتا ہے اور اسکی رسید تک نہیں دی جاتی جبکہ اس محکمے کے افسروں کے دلال نام نہاد ٹریڈ یونین کارکنوں کو درخواست دینے کے دو تین دن کے اندر اندر بغیر کسی تحقیق و تفتیش کے رجسٹریشن دے دیا جاتا ہے ان کارکنوں نے اس امر پر سخت افسوس کا اظہار کیا کہ یہ تمام باتیں تحریری شکایتوں، جلسوں اور قرار دادوں کے ذریعے حکومت کے علم میں لائی جاچکی ہیں مگر بہتری کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی۔

اسمٰعیل ٹیکسٹائل مل ورکرز یونین کے ممبروں کا جلسہ عام

خیرپور ۱۷ رجولائی۔ آج یہاں اسمٰعیل ٹیکسٹائل مل ورکرز یونین کے ممبروں کا ایک جلسہ عام مل کالونی میں منعقد ہوا جسمیں سال حال کے لئے درج ذیل عہدیداروں کا انتخاب عمل میں آیا۔

۱: محمد صدیق صدر ۲: حنیف اللہ نائب صدر سینیئر ۳: معین الدین نائب صدر جونیئر ۴: اعزاز نظیر جنرل سیکریٹری ۵: جمال الدین جوائنٹ سیکریٹری ۶: دریا خان خازن اور ۷: ولی صدیقی آفس سیکریٹری۔

ویسٹ پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز کی سرگرمیاں

حیدر آباد (نمائندہ منشور) ویسٹ پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز کی دسویں ڈیلی گیٹس کانفرنس ۶ر اور ۷ر جون ۶۵ء کو بسنت ہال حیدر آباد میں منعقد ہوئی مختلف صنعتوں کی ملحقہ مزدور انجمنوں سے تین سو سے زیادہ مندوبین نے اجلاس میں شرکت کی کانفرنس نے ویسٹ پاکستان کے مزدوروں کے مسائل پر حکومت کی لاپرواہی اور غیر دانشمندانہ پالیسی پر سخت تشویش کا اظہار کیا۔ کانفرنس نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ، مزدوروں کا ہڑتال کا حق بحال کیا جائے انجمن سازی پر عائد کردہ غیر مناسب پابندیاں ختم کیجائیں کانفرنس نے ویت نام اور ڈومینکن ری پبلک میں امریکی مداخلت کی سخت مذمت کی اور کشمیر اور رن کچھ کے تنازعات کو بھی سامراجی طاقتوں کا شاخسانہ قرار دیا اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ واضح اور غیر مبہم سامراج دشمن پالیسی اختیار کرتے ہوئے تمام فوجی معاہدوں کو ختم کرے اور کسی طرح کی مشروط امداد قبول نہ کرے

کانفرنس نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ چھوٹی صنعتوں کا مناسب طور پر تحفظ کیا جائے تاکہ بیڑی، پاور لوم اور ہینڈ لوم کی صنعتوں سے متعلق مزدور بے روزگاری حالاتِ کار کی خرابی اور کم اجرتوں سے نجات پاسکیں۔

کانفرنس نے تمام مزدوروں کے لئے لازمی پراویڈنٹ فنڈ، پنشن، انشورنس کی سہولتوں نیز کم از کم ڈیڑھ سو روپے ماہوار اجرت کا مطالبہ کیا۔

کانفرنس نے صنعتی تنازعات کے قانون مجریہ ۱۹۵۹ء میں حالیہ ترمیم، بذریعہ آرڈی ننس جسکے نتیجے میں مصالحتی افسر کو عدالتی اختیارات دیئے گئے ہیں پر سخت غم و غصے کا اظہار کیا اور مطالبہ کیا کہ ترمیم فوری طور پر واپس لی جائے اور مذکورہ قانون میں مزدور انجمنوں کی پیش کردہ سفارشات کی روشنی میں مثبت تبدیلیاں کی جائیں۔

کانفرنس سے جناب فیض احمد سیکریٹری جنرل آل پاکستان کنفیڈریشن آف لیبر، جناب اے ایس ایم سلیمان ممبر نیشنل اسمبلی و نائب صدر آل پاکستان کنفیڈریشن آف لیبر۔ آئی ایل او کے نمائندے برنی صاحب اور جرمن ٹریڈ یونین فیڈریشن کے دو نمائندوں نے بھی خطاب کیا۔

اس کانفرنس کے انعقاد کے اعلان کے بعد سے کچھ حلقوں کی طرف سے یہ پروپیگنڈہ کیا جا رہا تھا کہ کانفرنس اپنے مقاصد میں ناکام ہو جائے گی اور فیڈریشن کے انتخاب میں دھاندلی ہوگی جسکی وجہ سے ہڑبونگ مچے گی۔ لیکن ان حلقوں کو سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ خودغرض اور موقع پرست عناصر کی بڑی اکثریت کے فیڈریشن سے نکالے جانے کے بعد بہ آسانی یہ ممکن ہوا کہ فیڈریشن کے انتخابات جمہوری اور دستوری روایات کو قائم رکھتے ہوئے متفقہ طور پر ہوئے نئے منتخب شدہ عہدیداروں میں نوجوان اور سرگرم کارکنوں کی تعداد، کافی ہے جسکی وجہ سے یہ توقع ہے کہ فیڈریشن ایک سرگرم ادارہ کی حیثیت سے مزدور مفاد کا فرض انجام دیگی۔

کانفرنس نے جناب شمیم واسطی (حیدر آباد) کو صدر اور جناب ایم اے خطیب (کراچی) کو جنرل سیکریٹری منتخب کیا۔

بقیہ منتخب شدہ عہدیداروں کی تفصیلات حسب ذیل ہیں۔

جناب عبدالکریم قریشی (میاں والی) چیرمین۔ نبی احمد (کراچی) سینئر نائب صدر۔ اے کے منشی (کراچی) نائب صدر۔ صغیر احمد (کراچی) نائب صدر۔ ڈاکٹر اعزاز نظیر (خیر پور) نائب صدر۔ سید ریاض حیدر زیدی (لاہور) نائب صدر۔ سی پی دوطا (کراچی) جوائنٹ سیکریٹری۔ خورشید عالم (لاہور) جوائنٹ سیکریٹری۔ ایم رشید (کراچی) آرگنائزنگ سیکریٹری۔

اراکین مجلس عاملہ:۔

جناب امان اللہ خاں نیازی۔ صبغت اللہ خاں لودھی۔ حنیف صاحب ابن ایوب، کلیم اللہ، دلاور خاں، محمد یامین، مرزا عبدالعزیز، کے، بی مسعود، اشتیاق علی، ملک منیر، ایس، ایس، ایم ظفر۔ محمد عالم، حاجی شیر محمد سلطان علی۔ محمد جمال۔ واحد بشیر۔ پیر داد۔ حکیم عبدالغفور۔ محمد احمد۔ محمد جمن احمد خاں

جنرل کونسل:۔

جناب اسرافیل۔ خان صاحب۔ محمد یعقوب۔ بشیر احمد۔ محمد امیر محمد شیر۔ سعید الرحمٰن۔ حاجی عدیل۔ عبدالقدیر۔ محمد امیر۔ نصرت ہاشمی۔ احسان عظیم۔ آفتاب حسین۔ خواجہ فضل اللہ۔ لیبر خاں۔ خوشی محمد۔ عبدالکریم آغا خیر محمد۔ جے ایچ شیرازی۔ حافظ محمد یونس۔ طفیل عباس۔ سید شمس الحق علی محمد۔ داؤد شاہ۔ شیر زمان۔ صالح محمد۔ نظیر احمد۔ سراج الدین۔ محمد اقبال ظہور الدین۔ دلشن داس۔ شمس الاسلام۔ یوسف نور محمد۔ عمر خاں۔ راؤ منصب الانا خلاق۔ یوسف حسین۔

ویسٹ پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز کے نئے صدر کو استقبالیہ

کراچی (نمائندہ منشور) ویسٹ پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز کی کراچی کمیٹی کی طرف سے فیڈریشن کے نئے صدر جناب شمیم واسطی کو ۲۰ر جون ۶۵ء کو ڈینسو ہال میں استقبالیہ دیا گیا جسمیں فیڈریشن سے ملحقہ تمام یونینوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔

نئے صدر کا تعارف کراتے ہوئے کراچی کے ایکٹنگ جنرل سیکریٹری جناب نبی احمد نے کہا کہ ٹریڈ یونین کی جملہ کاروائیوں کو صحت مند اور جمہوری بنیادوں پر منظم کرنے کی پاداش میں شمیم واسطی صاحب نے جو قربانیاں دی ہیں ویسٹ پاکستان کے تمام مزدور انھیں قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ گذشتہ دو سال میں واسطی صاحب کو دو بار شہر بدر اور نظر بند کیا گیا اور بہت سے مقدمات میں ماخوذ کیا گیا۔ آج بھی طرح طرح سے رکاوٹیں پیدا کی جارہی ہیں۔ شروع شروع میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ، حکومت کی زیر سرپرستی قائم ہونے والے مختلف اداروں میں بانتخواہ رکنیت کی پیشکش کے ذریعہ آزاد مزدور تحریک کے سرگرم کارکن کو رام کیا جائے۔ ناکامی کی صورت میں انتقامی کاروائیاں عمل میں لائی گئیں۔ شمیم واسطی صاحب ان دونوں امتحانوں میں کامیاب رہے۔ اور آج انھیں یہ اعزاز حاصل ہوا کہ مغربی پاکستان کے تمام مزدوروں کے اعتماد کے ساتھ فیڈریشن کا صدر منتخب کیا گیا۔

فیڈریشن کے آرگنائزنگ سیکریٹری ایم رشید نے صدر کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔

فیڈریشن کے جنرل سیکریٹری جناب ایم اے خطیب نے حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ انکی خواہش یہ تھی کہ فیڈریشن کے عہدوں پر نوجوان اور پرخلوص کارکنوں کو لایا جائے۔ لیکن ساتھیوں نے انکار کے باوجود انھیں سیکریٹری چن لیا انھوں نے کہا کہ اسوقت ملک کی مزدور تحریک جس افراتفری کا شکار رہے اس کا، تقاضا یہ ہے کہ ہم سب اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ اس بات کی کوشش کریں کہ، مزدوروں میں زیادہ سے زیادہ تنظیمی شعور پیدا ہو اور ایک دیرپا اور صحتمند اتحاد قائم ہو۔ اس مقصد کے حصول میں ہمیں مختلف قسم کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور مجھے نئے صدر اور عہدیداروں سے پوری پوری توقع ہے کہ وہ ان ذمہ داریوں

کو بحسن وخوبی پورا کریں گے اپنی طرف سے انھوں نے یقین دلایا کہ نوجوان کارکن انھیں کبھی پیچھے نہیں پائیں گے۔

حکومت کی لیبر پالیسی کے متعلق انھوں نے کہا کہ کاغذ پر جو پالیسی لکھی گئی ہے موجودہ حالات میں ہم بھی اسے سراہتے ہیں۔ لیکن عملاً جو پالیسی اختیار کی جا رہی ہے وہ سراسر مالکان کے حق میں ہے اور مزدور مفاد کے منافی ہے انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ کچھ متعلقہ افسران نہ صرف یہ کہ غلط پالیسی اور غلط قوانین مزدوروں پر تھوپ رہے ہیں بلکہ مزدوروں کی صفوں میں انتشار پھیلانے میں سرگرمی کے ساتھ مصروف ہیں۔ انھوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ اس قسم کی سرگرمیوں کو ختم کرنے کی کوشش کرے اور صحیح اقدامات کے ذریعے صنعتی امن بحال کرنے کی کوشش کرے جو مزدوروں کو بہتر سہولتیں دیئے بغیر اور انکا اجتماعی سوداکاری کا حق بحال کئے بغیر ممکن نہیں۔

جناب شمیم واسطی صاحب نے استقبالیہ کا جواب دیتے ہوئے تمام نمائندگان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ مغربی پاکستان کے تمام ساتھیوں نے ان پر جس اعتماد کا اظہار کیا ہے وہ پورے خلوص اور دیانت داری کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دیں گے۔ صدر صاحب نے کہا کہ جس تحریک سے ہم لوگوں کا تعلق ہے اسے افراد کے بجائے اصولوں کے راستے پر چلنا چاہیئے اور یہ بھی فرمایا کہ آپ سب حضرات کے تعاون کے بغیر وہ اپنے فرائض بحسن وخوبی انجام نہ دے سکیں گے۔

اسٹیٹ بنک آف پاکستان ایمپلائز فیڈریشن کا قیام

اگرچہ اسٹیٹ بنک آف پاکستان کی تقریباً تمام شاخوں کے ملازمین کی انجمنیں کام کر رہی ہیں۔ لیکن انتظامیہ کی "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی پالیسی کی وجہ سے انمیں کوئی قابل ذکر اشتراک عمل نہیں پایا جاتا۔ ہر سنٹر اپنے اپنے مسائل میں الجھا ہوا ہے۔ جس وقت کراچی کے ملازمین اسٹیٹ بنک زبردست مظاہرے کر رہے تھے اس وقت مشرقی پاکستان کی انجمنیں ان ہی مطالبات پر انتظامیہ سے معاہدے کر رہی تھیں۔ ایسی صورت حال کے پیش نظر یہ مشکل تھا کہ ہم انتظامیہ سے اپنے تمام جائز حقوق منوا لیتے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے ایک مشترک اور مضبوط ادارہ کی ضرورت کو محسوس کیا گیا۔ اس سلسلے میں کراچی میں ایک کانفرنس بلائی گئی جسمیں مغربی پاکستان کے نمائندوں نے شرکت کی۔ پشاور سے جناب خواجہ محمد یونس اور جناب غلام انبیا۔ لاہور سے جناب محمد یوسف اور جناب محمد یوسف بٹ، لائلپور سے جناب محمد رمضان اور جناب شمشاد احمد۔ کوئٹہ سے جناب محمد اسلم اور کراچی سے جناب سراج الحق چودھری اور محمد باری نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔

اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے یونین نمائندگان کی یہ کانفرنس کراچی کے نیو کشمیر ہوٹل کمرہ ۱۰ میں مورخہ ۱۱ر جولائی ۶۵ء سے ۱۶ر جولائی ۶۵ء تک جاری رہی یہ کانفرنس اس نوعیت سے بھی ناقابل فراموش ہے کہ یہ آزادی ملک کے بعد اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے ملازمین کے نمائندوں کی پہلی کامیاب کانفرنس تھی آپس میں تبادلۂ خیالات کیا گیا۔ مختلف مسائل پر کھل کر گفتگو ہوئی۔ موجودہ ماحول کے پیش نظر مغربی پاکستان کی بنیاد پر ایک فیڈریشن کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کا نام "اسٹیٹ بنک آف پاکستان ایمپلائز فیڈریشن" (مغربی پاکستان) تجویز ہوا۔ دستور پاس کیا گیا اور مندرجہ ذیل نمائندوں پر مشتمل ایک ایڈھاک کمیٹی مقرر کی گئی۔

۱:- صدر محمد یوسف صاحب (لاہور)

۲:- نائب صدر محمد یونس (پشاور) اور ولی الدین صاحب (نمائندہ ملازمین درجہ چہارم کراچی)

۳:- سیکریٹری جنرل سراج الحق صاحب (کراچی)

۴:- اسسٹنٹ سیکریٹری جنرل محمد اسلم صاحب (کوئٹہ)

۵:- فنانس سیکریٹری محمد باری صاحب (کراچی)

۶:- جیلانی صاحب ممبر

۷:- محمد رضوان صاحب (لائلپور) ممبر

اس فیڈریشن کے قیام سے اسٹیٹ بنک آف پاکستان میں مزدور تحریک کو پروان چڑھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ آجر، اجیر، اور اجرت کے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ اس بنک کی مختلف برانچوں کی انجمنوں کو مزید تعمیری کام کرنے کے لئے اس فیڈریشن سے رہبری ملے گی۔ اس کے علاوہ اب ملازمین کے جائز اور قانونی حقوق کے حصول اور تحفظ کے سلسلے میں زیادہ بہتر، موثر اور بڑے پیمانے پر کوشش کی جا سکتی ہے۔ اس لحاظ سے فیڈریشن کا قیام بہت زیادہ مستحسن ہے۔

علاوہ ازیں بارہ افراد پر مشتمل مجلس عاملہ منتخب کی گئی۔ جلسہ میں۔ ہڑتال کے حق کی بحالی ۱۵۰ روپے کم سے کم تنخواہ کے تعین، مفت رہائشی کوارٹر اور طبی امداد، مزدور کارکنوں پر قائم شدہ مقدمات کی واپسی پر متفقہ طور پر قراردادیں منظور کی گئیں۔

ویت نام پر امریکی حملہ کی مذمت

امریکہ کے فوجی معاہدے ختم کرو میرپورخاص جلسہ عام کی قرارداد

میرپورخاص۔ ویسٹ پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈ یونین کے صدر مسٹر شمیم واسطی کی زیر صدارت بتاریخ ۸ر جولائی ۶۵ء یہاں مزدور جماعتوں کا ایک مشترکہ جلسہ عام منعقد ہوا جس میں ضلع مزدور کمیٹی کے جنرل سیکریٹری مسٹر سراج الدین نے مزدوروں کی طرف سے صدر موصوف کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا اور جناب شمیم واسطی۔ جناب نبی احمد کراچی۔ جناب محمد حسن حیدرآباد، جناب احسان عظیم کوٹری۔ جناب لاکھانہ بلوچ حیدرآباد۔ جناب آغا خیر محمد ایڈووکیٹ میرپورخاص نے جلسے سے خطاب کیا اور مزدور مسائل پر تقاریر کیں۔ جلسے نے ویت نام پر امریکی حملے کی مذمت کی اور حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا کہ وہ سیٹو اور سینٹو جیسے بے مقصد معاہدوں سے علیحدہ ہو جائے۔ ایک قرارداد میں حکومت سے مطالبہ کیا کہ سیفٹی ایکٹ سیکورٹی ایکٹ، پریس آرڈیننس، یونیورسٹی آرڈیننس سیاسی جماعتوں کا قانون مزدور قوانین (ترمیمی آرڈیننس) جسکے ذریعے انجمن سازی تک پر پابندی لگادی گئی ہے۔ اور دیگر ایسے ہی کالے قوانین ختم کئے جائیں۔ اس سے پہلے صبح ۹ بجے ریلوے اسٹیشن سے فیڈریشن کے صدر صاحب کا ایک بڑا جلوس نکالا گیا جس میں شہر کے تانگے، ٹیکسیاں اور گدھا گاڑیاں شامل تھیں۔

منشور سب کا ہے

خود پڑھئے

اور

دوسروں کو

پڑھائیے

نیشنل بنک آف پاکستان کے ملازمین کے مطالبات

کراچی (نمائندہ منشور) نیشنل بنک آف پاکستان ملک کا سب سے بڑا، قومی بنک ہے۔ تقریباً ۱۲ ہزار ملازمین کام کرتے ہیں۔ ان ملازمین کی شب و روز کی محنت سے بنک نے جو شاندار ترقی کی ہے۔ وہ ایک مثال ہے۔ بنک نے ۶۴ء میں تین کروڑ روپے کا منافع کمایا جس میں صرف کراچی آفس نے ایک کروڑ بارہ لاکھ منافع حاصل کیا۔ نیشنل بنک کی یونین نے اس مثالی منافع کے پیش نظر بونس میں منافع کا مطالبہ کیا تھا۔ یونین کا موقف یہ تھا کہ گزشتہ تین برس سے ملازمین کو بونس میں کوئی اضافہ نہیں دیا گیا۔ اس لئے اس سال ان کے اس جائز مطالبے کو پورا کیا جائے۔ اس سلسلے میں بنک کے منیجنگ ڈائرکٹر صاحب نے



نیشنل بنک کے ملازمین کا مظاہرہ

نہ صرف یونین کو یقین دہانی کی تھی۔ بلکہ زائد بونس کی ادائیگی کی سفارش بورڈ سے بھی کی۔ لیکن اس کے باوجود بونس میں اضافے کا مطالبہ منظور نہیں کیا گیا۔ یونین نے اس زیادتی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ اتنے کثیر منافع کے باوجود ملازمین کو بونس میں اضافہ نہ دیکر اور شیئر کی قیمت میں ۲۵ روپے سے ۵۰ روپے کا اضافہ کرکے اسّی لاکھ روپیہ خود حاصل کرکے انتظامیہ اور بورڈ کے نمائندوں نے ملازمین کے ساتھ ظلم کیا ہے۔ ملازمین کا یہ احتجاج کل پاکستان پیمانے پر شدت اختیار کر گیا۔ یہاں تک کہ آفیسرز ایسوسی ایشن بھی اس زیادتی کے خلاف احتجاج میں شریک ہو گئی۔ اور افسران نے اس زیادتی کے خلاف احتجاجاً مشترکہ طور پر اپنے استعفے پیش کر دیئے۔ صورت حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے منیجنگ ڈائرکٹر صاحب نے یونین کے نمائندوں کو کراچی اور لاہور دونوں جگہوں پر یقین دلایا کہ آئندہ سال ان کو زائد بونس ضرور دیا جائے گا۔

ملازمین وعدۂ فردا سے مطمئن نہیں ہوئے اور کراچی لاہور ڈھاکہ اور دیگر تمام یونینوں نے ملازمین کی طرف سے تحریری طور پر بونس نہ لینے کا فیصلہ انتظامیہ کو روانہ کر دیا۔ اس کے باوجود انتظامیہ نے بونس کی رقم ملازمین کے اکاونٹ میں کریڈٹ کرنا شروع کر دی تو ملازمین کو مجبوراً شدید احتجاجی مظاہرہ کرنا پڑا۔ ردِ عمل کے طور پر منیجنگ ڈائرکٹر صاحب نے لاہور اور کراچی کی یونینوں کے نمائندوں کو یقین دلایا کہ وہ بونس میں اضافے کے بجائے اگر کوئی اور مطالبہ پیش کریں تو اسے منظور کر لیا جائے گا۔ اس یقین دہانی کی بنا پر ملازمین نے احتجاج بونس قبول کرتے ہوئے یہ مطالبہ پیش کیا کہ ان کے مہنگائی الاؤنس کو تنخواہ میں ضم کر دیا جائے اور جونیئر افسران کی طرح ان کے لئے بھی کرایہ مکان مقرر کیا جائے۔ واضح ہو کر جونیئر افسر جنکی تنخواہ سپروائزر سے ۲۵ روپے زائد ہوتی ہے ۲۵۰ روپے کرایہ مکان پاتا ہے۔ جبکہ سپروائزر صرف ۳۷۔ کلرک صرف ۱۰۔ اور چپراسی کو ۱۰ روپے ماہوار کرایہ مکان ملتا ہے۔

انتظامیہ نے یقین دلایا کہ اگر ملازمین احتجاجی اقدامات بند کر دیں بونس کے مسئلہ کو نہ اٹھائیں تو ان کے یہ جائز مطالبات مان لئے جائیں گے۔ یونین کے نمائندوں نے اس یقین دہانی پر بھروسہ کرتے ہوئے احتجاج ختم کرکے نئے مطالبات (جن کو ۱۰ مارچ ۶۵ء کو پیش کیا گیا تھا) کی منظوری کے لئے کوشش شروع کر دی۔ انتظامیہ مختلف بہانوں سے ٹالتی رہی اور جب اس نے محسوس کر لیا کہ یونین مزید تاخیر برداشت نہ کر سکے گی تو وہی مخصوص حربہ استعمال کیا جو مزدور تحریک کو کمزور کرنے کے لئے سرمایہ دار عام طور پر استعمال کرتے رہتے ہیں۔

یونین کے صدر اور سیکریٹری جنرل کو ترقی دے کر افسر بنا دیا گیا۔ اس سلسلے میں قابل ذکر امر یہ ہے کہ سیکریٹری جنرل کی ملازمت کل سات سال کی ہے ان کو سپروائزر ہوئے ابھی صرف آٹھ ماہ ہوئے تھے۔

اور وہ اپنے موجودہ عہدے پر ابھی مستقل بھی نہ ہوئے تھے۔ بنک کے کئی سوپروائزر جو مدت ملازمت میں اور قابلیت کے لحاظ سے بھی سیکریٹری جنرل سے سینئر تھے ترقی کے لئے مستحق نہ تصور کئے گئے۔ لیکن یونین کو کمزور کرنے کے لئے انتظامیہ نے ایک غیر مستقل سپروائزر کو ترقی دینا جائز تصور کر لیا۔ یونین دشمنی کی اتنی بدترین مثال نیشنل بنک کی تاریخ میں نہیں ملے گی۔ انتظامیہ کا خیال یہ تھا کہ اس طرح ملازمین کی توجہ مطالبات سے ہٹ جائے گی اور ساتھ ہی یونین کے استحکام میں بھی فرق آجائے گا۔ لیکن یونین کے صدر نے جنکو تیرہ برس کے بعد جائز ترقی ملی تھی انتظامیہ کے اس رویہ کے خلاف احتجاجاً ترقی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔



یونین کے عہدیداران

انتظامیہ نے اپنے آخری حربے کو ناکام ہوتے دیکھ کر مطالبات تسلیم کرنے سے یکسر انکار کر دیا۔ ملازمین نے اس ناروا سلوک کے خلاف ۱۹ جون ۶۵ء کو مظاہرہ کیا انتظامیہ نے فوراً مسئلہ لیبر آفس کے سپرد کر دیا لیکن ساتھ ہی ملازمین کو ہراساں کرنے کے لئے نہ صرف دھمکیاں دی جانے لگیں بلکہ یونین کے نمائندوں کے خلاف خود منیجنگ ڈائرکٹر صاحب نے پولیس میں فرضی رپورٹ بھجوا دی۔ شاید یہ قدم نیو جوبلی انشورنس کمپنی کی انتظامیہ کی تقلید میں اٹھایا گیا تھا۔ لیکن ملازمین متحد اور پرامن رہے اور انھوں نے اپنے جائز مطالبات کو منوانے کی جدوجہد جاری رکھی۔

مہنگائی الاؤنس کو تنخواہ میں ضم کر دینے کا مطالبہ آتا جاتا ہے کہ اس میں پس وپیش کی گنجائش نہیں ہے۔ حکومت پاکستان کے علاوہ اسٹیٹ بنک ایگریکلچر بنک۔ انڈسٹریل بنک۔ اور بھی بہت سے بنکوں نے یہ مطالبہ منظور کر لیا ہے لیکن اس کے باوجود نیشنل بنک کی انتظامیہ کا اس مطالبے کی منظوری سے انکار اور یونین کے ساتھ معاندانہ رویہ افسوسناک ہے۔

یونین سیکریٹری جنرل کی ناجائز ترقی کے مسئلہ کو عدالت میں لے جا رہی ہے اور اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ایک طرح کی کھلی ہوئی سیاسی رشوت ہے جسکا مقصد مزدور تحریک کو نقصان پہنچانے کے سوا کچھ نہیں۔

یونین کے مطالبات کے سلسلے میں لیبر آفیسر آفس کے اندر ہونے والے مذاکرات ناکام ہو چکے ہیں اور ناکامی سرٹیفکٹ جاری کر دیا گیا ہے۔ ملازمین میں بڑھتی ہوئی بے چینی کے پیش نظر انتظامیہ کو یہ مسئلہ جلد طے کر دینا چاہیئے۔ تاکہ ملک کے اس بڑے قومی ادارے میں صنعتی امن قائم رہ سکے۔

میونسپل ایمپلائز یونین بنوں کے سالانہ انتخابات

بنوں (نمائندہ خصوصی) - میونسپل ایمپلائز یونین رجسٹرڈ بنوں کا سالانہ الیکشن کے سلسلے میں پہلی نشست کا اجلاس عام زیر صدارت جناب سردار علی رطل فخر ملازمین لوکل باڈیز و صدر یونین ہذا ۹ بجے رات ٹاؤن ہال میں منعقد ہوا تلاوت کلام پاک کے بعد جنرل سیکریٹری مسٹر صاحب زمان نے سالانہ رپورٹ پیش کی جسے اجلاس نے درست قرار پایا۔ بعد ازاں مسٹر عبدالخالق پرویز خزانچی نے سالانہ آمدنی و خرچ کا گوشوارہ پیش کیا جو منظور کرایا گیا۔ صاحب صدر مسٹر رطل خان نے اپنی مختصر سی تقریر میں اسٹاف چونگی کو اس امر کی تلقین کی کہ وہ نہ تو خود کوئی غلط کام کریں اور نہ دوسروں کے اشاروں پر کوئی ایسا کام کریں جس سے کمیٹی کی آمدنی کو نقصان پہنچے۔ بلکہ ہم سب کی عزت اور سرخروئی اسی میں ہے کہ ہم آمدنی میں قابل قدر اضافہ کریں۔ اس کے بعد آپ نے باڈی توڑنے کا اعلان کیا۔

تھوڑی دیر بعد دوسری نشست کا اجلاس زیر صدارت جناب گل نواز خان سینئر سینٹری انسپکٹر کوئی ۱۰ بجے رات منعقد ہوا۔ عہدۂ صدارت کے دو امیدواران صاحب زمان اور شیر نواز خان تھے۔ جبکہ چپراسیوں کی طرف سے صدارت کے لئے محمد اسلم اور امیر زاہد اللہ امیدوار تھے۔ جناب رطل صاحب نے ان صاحبان سے درخواست کی کہ وہ باہمی اتحاد کے پیش نظر ایک ایک امیدوار نام واپس لے لے۔ چنانچہ شیر نواز خان اور محمد اسلم نے اپنے نام واپس لے لئے اسی طرح صاحب زمان صدر اور امیر زاہد اللہ جونیئر صدر منتخب ہوئے۔ بعد میں حسب ذیل انتخاب متفقہ طور پر عمل میں لایا گیا۔

سینئر نائب صدر محمد یار۔ جنرل سیکریٹری سردار علی رطل (کل وقتی با تنخواہ)۔ جائنٹ سیکریٹری عبدالخالق پرویز۔ پراپیگنڈہ سیکریٹری غازی جان۔ خزانچی محمد ابراہیم شاہ۔

اس کے علاوہ حسب ذیل ایگزیکٹو کونسل کے ممبران منتخب ہوئے۔
شیر نواز - احمد حسن - عظیم اللہ - میاں گل بہار شاہ - رحیم خان - حق نواز محمد علی (I) فضل حق -

ایڈیٹران - میر کبوت اور عزیز نواز منتخب ہوئے۔

اس کے بعد فنانس سب کمیٹی کے لئے حسب ذیل چناؤ عمل میں لایا گیا۔ گل ولی - سبز علی - گل آزاد - میر شیر بم - محمد علی (II) محمد نواز شاہ اور پیر مغل شاہ - کو سیکریٹری تنظیم مقرر کیا۔ انتخاب کے بعد درج ذیل قرار داد اور فیصلہ جات منظور کئے گئے۔

ایک قرارداد میں میونسپل کمیٹی سے مطالبہ کیا گیا کہ ریلوے اسٹیشن کی موجودہ چونگی کو ریلوے اسٹیشن میں منتقل کیا جائے۔ تاکہ چونگی چور مختلف راستوں سے حدود کمیٹی میں غیر قانونی طور پر مال درآمد نہ کر سکے۔ دوسری قرارداد میں فیصلہ کیا گیا کہ جناب رطل صاحب کو جنرل سیکریٹری کے کام کے لئے کل وقتی با تنخواہ ملازم یونین تصور کیا جائے۔

بنوں (نمائندہ خصوصی) گزشتہ روز خواجہ سید الدین اسسٹنٹ ڈائرکٹر لیبر ویلفیئر کانسلیشن مغربی پاکستان پشاور اور جناب این اے فاروقی صاحب ڈویژنل لیبر آفیسر میونسپل ایمپلائز یونین (رجسٹرڈ) بنوں کے نوٹس ہڑتال کے سمجھوتے کے سلسلے میں بنوں آئے تھے۔ مصالحتی افسر نے یونین اور انتظامیہ بلدیہ کے مابین نوٹس ہڑتال پر مصالحتی کاروائی شروع کی۔ یونین کی طرف سے جناب سردار علی رطل صدر اور صاحب زمان جنرل سیکریٹری بلدیہ کی طرف سے خان بادشاہ سیکریٹری۔ حقداد خاں سپرنٹنڈنٹ چونگی نے مصالحتی کاروائی میں حصہ لیا۔ چنانچہ کافی بحث و تمحیص کے بعد یونین کی طرف سے دس مطالبات پر حسب ذیل ایگریمنٹ ہوا۔

۱:- بلدیہ عملہ چونگی کی شب باشی الاؤنس جاری کرانے کے لئے کمشنر سے منظوری کی سفارش کریگی۔

۲:- اسٹاف چونگی کو موسم کے مطابق وردیاں دی جائینگی۔

۳:- مسٹر گلزار خاں سینئر سینٹری انسپکٹر و دیگر متاثرہ اہلکاران جنہیں ۱۴ اکتوبر ۵۵ سے بقایا جات نہیں ملے وہ تحریری طور پر کمیٹی سے درخواست کریں اگر ان کی شکایات درست پائی گئیں تو انھیں بقایا جات ادا کر دیئے جائیں گے۔

۴:- چوکیات چونگی رسالہ، نکلسن اور ریلوے گیٹ کے لئے بھی ٹیبل فین دیئے جائیں گے۔

۵:- عملہ چونگی میں نئے قوانین چونگی کی دفعہ ۷۶ کی رو سے راہداری ریفنڈ سسٹم جاری کر دیا جائے گا۔

۶:- کسی محرر یا چپراسی کو ایک ہی چونگی پر ایک ماہ سے زائد نہ رکھا جائیگا۔

۷:- کمیٹی بلدیہ کے ملازمین کو ان کی تنخواہ کی دس فیصد حساب پر طبی سہولیات کی ہر ماہ تنخواہ کے ساتھ دے گی۔ اسکی منظوری کمشنر صاحب سے حاصل کیجائے گی۔

باقی تین مطالبات واپس لے لئے گئے۔

اس معاہدہ پر بلدیہ کے چیئرمین عبدالقادر خاں (اے سی) اور صدر یونین سردار علی رطل و صاحب زمان جنرل سیکریٹری نے دستخط کئے۔

لوگ کہتے ہیں



کوئی چیز تنقید سے بالاتر نہیں ہوتی۔ منشور بھی یقیناً تنقید کا مستحق ہوگا — ہم اپنے قارئین کے مشکور ہیں کہ انھوں نے شروع سے اب تک ہماری حقیر کوششوں کو سراہا۔ اب ہم سمجھتے ہیں کہ تعریف و توصیف کے خطوط کی اشاعت کا سلسلہ ختم کر دینا چاہیئے۔ "لوگ کہتے ہیں" کے صفحات قارئین کے لئے وقف ہیں۔ لیکن ہماری گزارش ہے کہ قارئین تعریفی خطوط کے بجائے منشور میں شائع شدہ مضامین افسانوں اور منظومات پر بحث و تنقید میں حصہ لیں۔ بہتر ہوگا کہ یہ کالم مختلف قسم کے سماجی، سیاسی، معاشی، ادبی علمی موضوعات پر صحت مند بحث کے کام آئیں۔ توقع ہے کہ قارئین تعاون کریں گے اور تعریفی خطوط سے گریز کر کے سنجیدہ اور صحت مند تنقیدی مراسلات لکھا کریں گے۔

(ادارہ)

کراچی

محترمی ایڈیٹر منشور۔

منشور کا مطالعہ پابندی کے ساتھ کرتا ہوں۔ اور بے چینی سے انتظار بھی رہتا ہے۔ اس حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ مغربی پاکستان کا واحد ماہنامہ، منشور ہے جو ملک کے لئے ہے۔ عوام کی خاطر ہے، مزدوروں کی آواز ہے۔ مگر مزدور کے لئے بیکار ہے۔ کیونکہ مزدور مطلق ان پڑھ ہے۔ مزدور کو شوق ہے۔ مگر اندھا ہے، جبکہ تنخواہ بھی انگوٹھا لگا کر لیتا ہے۔

کاش ہمارے ملک کے سرمایہ دار دولت کے ساتھ تعلیم کو تجوری میں محصور نہ کرتے۔ اسکی بدترین مثال ۷ رجولائی کو میرے ساتھ پیش آئی۔ جبکہ ایک مقامی پرائمری و سرکاری اسکول میں داخل کرانے کی ناکام کوشش کی بگر دائے تعلیمی نظام، داخلے کا رجسٹر پُر ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود دس روپے داخلہ جاری تھا۔ رشوت خور چور بازار، اسمگلر، سفارشی، حکومت کے غلام قسم کے لوگ جو اسکوٹر اور کاروں پر آنے والے تھے ان کے بچے داخل ہوتے رہے۔ دو سال سے ناکام ہوتا رہا۔ میں سوچتا ہوں یہ بچے دوسروں کی تجوریں بھرنے کے لئے تو پیدا ہوئے ہیں، مگر ہماری طرح جاہل وان پڑھ رہ کر اور بڑے ہو کر ماں باپ کو مورد الزام ٹھہرائیں گے۔

یہ باتیں چھوڑیئے، یہ تو پورے معاشرے کے لئے زہر کی پوٹ ہے منشور کے مضامین، نظمیں، غزلیں۔ افسانے، اقتباسات طنز و مزاح، مارکوپولو، اسد علی اور خاص کر آپ کا اداریہ جو اپنی خصوصیت الگ قائم کئے ہوئے ہے۔ رئیس امروہوی اور ذکی عباس بہت دنوں سے منشور کے صفحات سے روپوش ہیں۔ ذکی عباس کا مضمون "میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند" جیسے فلسفیانہ مضامین دوسرے تیسرے ماہ ضرور دیا کریں۔ اس شمارے میں "ایک بات، روٹی، پشاور کے قہوہ خانے، رفاقت اے وطن، اور بجٹ پر اداریہ پسند آئے، چوڑیوں والی اپنی نوعیت کا واحد افسانہ ہے اس تخلیق پر عبداللہ عرفان صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

("سوچتی ہوں کیا مجھے بھی گلی گلی کوچہ کوچہ چوڑیاں بیچنی پڑیں گی")؟

(مرزا رجب بیگ سیتاپوری)

بمبئی

برادرم۔!

آپ کا خط ملا۔ بیحد شکر گزار ہوں۔

منشور کے پچھلے چند شمارے نظر سے گذرے۔ آپ جس خوبصورتی اور لگن کے ساتھ پرچہ نکالتے ہیں وہ یقیناً قابلِ داد ہے۔ فنی اور جمالیاتی معیار کو برقرار رکھتے ہوئے تعمیری اور مقصدی ادب پیش کرنے میں پاکستان کا کوئی دوسرا رسالہ "منشور" کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

میری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں اور میں آپ کی ترقی کے لئے دعاگو ہوں۔

(ساحر لدھیانوی)

پشاور

سبط بھیا۔ آداب!

آج پہلی بار ایک مزدور بزرگ کے ذریعہ "منشور" پڑھنے کا موقع ملا۔ جون کے شمارے کے سرورق پر "ہمارے خون کو ارزاں خریدنے والو" کی للکار ہی نے میرے دل میں پورا "منشور" پڑھنے کا جذبۂ شوق بیدار کر دیا۔ اور جوں جوں میں اندر کے صفحات پڑھتا رہا خود کو ادب و سیاست کی رنگین وادیوں میں کھوتا رہا۔ ادب و سیاست کا مرقع یہ جریدہ بنی نوع انسان کو جرأت، ہمدردی اور خلوص کا سبق دے رہا ہے۔ یہ شاید ہی کوئی اور دے سکے۔ نسیم شاد کا "انکل سام کے نام ایک خط" اور اداریہ "اصل دشمن کون" دونوں ایسے آئینے ہیں جن میں بے حیا سامراج کی متعصبانہ ذہنیت، نفاق پسندی اور مفاد پرستی کے عکس صاف اور واضح نظر آتے ہیں۔ سامراجیت کے اس طوفانی دور میں آپ نے اخوت و مساوات کی جو شمع روشن کی ہے اسکی روشنی انسانیت کے سینے کو ہمیشہ منور کرتی رہے گی۔ علاوہ ازیں عوام کی اقتصادی حالت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آپ نے اپنے جریدے کی قیمت جس قدر کم رکھی ہے اس کے لئے انسانیت آپکی ممنون رہے گی۔ ان تمام کوششوں کے لئے میرا شکریہ قبول کیجئے

(اورنگ زیب)



بونس واؤچر
۷,۴۰۰,۰۰ روپے
ایکس پلانٹ کراچی
۲۲,۲۲۰,۰۰ روپے

A PRODUCT OF CHRYSLER INTERNATIONAL

آپ کے لئے آسان قسطوں پر
مکمل پرزہ جات
حاضر اسٹاک سے دستیاب ہیں

رجوع کریں:- **کراچی آٹوز** گارڈن روڈ ۔ کراچی
فون ۔ ۷۰۰۰۸ - ۷۲۷۰۲ - ۷۱۳۹۲ - ۷۰۲۱۵ - ۹۰-۷۱۹۸۵

noon advertising

REGD.NO. S - 2575

THE MONTHLY MANSHOOR KARACHI